اقبال
اور

اقبال اور مسٹر

"اقبال اور مُلّا" کا حقیقت افروز جواب علامہ اقبال کی ذاتی خواہشات دینی خیالات اور مذہبی جذبات کی روشنی میں

نظر کو خیرہ کرتی ہے. چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
(اقبال)

اقبالؒ اور مسٹر

اقبال اور مُلّا کے مصنّف کیلئے سرمایۂ بصیرت

★

مُصنّفہ

منشی عبدالرحمٰن خاں

شائع کردہ

گوشۂ ادب • چوک انار کلی • لاہور

اشاعت اول اکتوبر ۱۹۵۵ء ۱۰۰۰

اشاعت دوم اپریل ۱۹۵۶ء ۱۰۰۰

★

ناشر: گوشۂ ادب۔ انار کلی۔ لاہور

طابع : انتشار پریس اردو بازار لاہور

اُن کے نام

جو علومِ اسلامیہ سے ناواقف ہونے کی وجہ سے
اسلام۔ قرآن اور اقبال کے نام پر فریب دے کر
لادینی کی طرف لے جانے والے مجتہدوں اور مفکروں
کے اجتہاد سے متاثر ہو رہے ہیں۔

پیغامِ اقبالؒ

مسلمانوں نے دُنیا کو دکھانے کے لئے دنیری تعلیم حاصل کرنی چاہی۔ لیکن نہ تو دنیا حاصل کر سکے اور نہ دین سنبھال سکے۔

اسلام تہذیب حاضرہ کی تمام ضروری اور اصولی چیزوں کا دشمن ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اُسے تباہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ نہ یہ کہ ان چیزوں کو جزوِ اسلام بنا لیا جائے۔"

فہرس

مظلومِ اقبالؒ

علامہ اقبال کے نام۔ کلام اور پیغام پر یوں تو اتنا لکھا جا چکا ہے کہ مزید کچھ لکھنا بے سود معلوم ہوتا ہے مگر افسوس کہ کسی نے ان کی داستانِ مظلومیت پر قلم نہیں اٹھایا۔ یہ داستان جتنی طویل ہے اتنی دردناک بھی ہے۔ جس کی تفصیل کے لئے علیحدہ دفتر کی ضرورت ہے۔ یہاں پر اس کی صرف نشاندہی تک اکتفا کیا جاتا ہے۔

اس میں کسی کو کلام نہیں کہ علامہ اقبال شمع نبوتؐ کے پروانہ تھے اور امتِ مسلمہ کو خدا و رسولؐ کا پیغام پہنچانے کے معاملہ میں دیوانہ تھے۔ یہی ان کا مقصدِ حیات تھا۔ اور اسی نے انہیں مقبولیتِ عام اور حیاتِ دوام بخشی۔

اقبال کے پیغام نے نوجوانانِ اسلام کو کفر و الحاد کے اس سیلاب سے بچا لیا۔

جو مغرب کی طرف سے آرہا تھا۔ اس سے ان لوگوں کے مفاد و مقاصد کو نقصان پہنچا۔ جو اسلام اور قرآن کے پردہ میں ہمارے نوجوانوں کو لامذہبیت اور مغربیت کی طرف لے جارہے تھے۔ اس گروہ نے اقبال کی روز افزوں محبوبیت و مقبولیت سے فائدہ اٹھانے کے لئے، اس کی یادگار کے طور پر دہلی سے ایک "ملی اسلامی مجلہ" بنام "طلوع اسلام" جاری کیا۔ جواب کراچی سے شائع ہو رہا ہے۔

عوام پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ یہ رسالہ علامہ اقبال کے خیالات کا ترجمان ہے۔ اس کے سرورق پر مدتوں

"بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ"۔

کے الفاظ اور ان کا فوٹو شائع کیا جاتا رہا۔ اور اس کے مدیر مسٹر پرویز نے دنیا کو اس بات کا مزید یقین دلانے کے لئے یہاں تک لکھ دیا کہ ان کے اجتہاد کا نکتہ علامہ اقبال کے ذہن کا رہینِ منت ہے۔

اس آڑ میں انہوں نے سرکارِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو جھٹلانا مسلمانوں کو اطاعتِ رسول اور تقلیدِ سلف سے منحرف کرنا اور اقبال کو منکرِ حدیث ثابت کرنا شروع کردیا۔ اقبال کے شاگردانِ رشید اور بہی خواہ اس رسالہ میں اپنے مضامین اور اشعار شائع کرا کر اس کی اہمیت بڑھانے میں ممد و معاون رہے۔ گویا انکارِ حدیث

کی مہم اس اقبال کے نام پر، اور اس کی یادگار کے طور پر چلائی جاتی رہی۔ جو لکھتے ہیں کہ:۔

"میرا عقیدہ ہے کہ نبی کریمؐ زندہ ہیں۔ اور اس زمانے کے لوگ بھی ان کی صحبت سے اس طرح مستفیض ہو سکتے ہیں جس طرح صحابہ ہُوا کرتے تھے" (مکاتیب اقبال ص۱۲)

یہ علامہ اقبال پر بہا ظلم تھا۔ جو اس کے بہی خواہوں کی اعانت سے اس پر ڈھایا گیا۔

علماء کرام نے بروقت قوم کو اس فتنہ سے آگاہ کرنا شروع کیا۔ اس کی تردید میں بڑے قیمتی اور پُر از معلومات مقالات لکھے۔ اور بڑی کدوکاوش سے علامہ اقبال کے کلام سے ان اشعار کو انتخاب کر کے شائع کیا۔ جن میں مضامین احادیث بیان کئے گئے تھے۔ اور اس طرح دنیا پر ثابت کر دیا۔ کہ علامہ اقبال نہ منکر حدیث تھے۔ نہ منکران حدیث کے امام۔ جیسا کہ رسالہ طلوع اسلام ان کو ظاہر کر رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پرویز اینڈ کو نے علماء کرام کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا۔ اور ان کو عوام کی نظروں میں گرانے اور ان کا اثر و رسوخ گھٹانے کے لئے ان پر بہتان لگانے شروع کر دیئے۔ مگر چالاکی یہ کی کہ اس محاذ پر بھی انہوں نے علامہ اقبال کو ہی لا کر آگے کھڑا کر دیا۔ اور ان کے کندھے پر بندوق رکھ کر علماء کرام کو نشانہ ستم

بنایا جانے لگا۔

اس سلسلہ میں بزمِ اقبال لاہور نے "اقبال اور ملّا" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ علامہ اقبال مدعیانِ دین اور حامیانِ شرعِ متین کو دین کے لئے ایک خطرہ سمجھتے تھے۔ ان سے انہیں خیر کی قطعاً امید نہیں تھی۔ وُہ نہ ان میں کسی معاملہ کو سمجھنے کا شعور دیکھتے تھے اور نہ ان میں لطیف جذبات و افکار پاتے تھے وقس علیٰ ہٰذا۔

اس طرح اس رسالہ کے مصنّف نے علماء کرام کو بدنام اور ذلیل کرنے کی غرض سے بیچارے اقبال کے نام ایسی باتیں منسوب کر دیں۔ جن کی نہ ان سے توقع ہو سکتی تھی، اور نہ فی الواقعہ انہوں نے ایسی باتیں کہی تھیں۔ بلکہ ان کے ارشادات ان باتوں کی تردید و تکذیب کرتے تھے۔

اقبال پر بہتان باندھنے سے ان کی غرض یہ تھی کہ اس طرح

۱۔ مغرب زدہ طبقہ میں علماء کے خلاف مزید نفرت پیدا ہو جائے گی۔ وہ ان کے قریب نہ جائے گا۔ اور اس پر علومِ دین حاصل کرنے کے دروازے بدستور بند رہیں گے۔

۲۔ دیندار طبقہ کے دل میں علامہ اقبال کی جو عزت و عظمت۔ محبت و عقیدت پائی

جاتی ہے۔ وہ جاتی رہے گی۔ وہ انہیں اپنا دشمن سمجھے گا اور آئندہ کے لئے کم از کم
ان کے کلام سے تمسک کر کے دینِ پرویز کی تردید نہیں کرے گا۔

گویا اقبال کے نام کو مسلمانوں کے دو طبقوں میں منافرت پھیلانے کے لئے
استعمال کیا گیا۔ یہ علامہ اقبال پر دوسرا ظلم تھا۔ جو بزم اقبال کی طرف سے توڑا گیا۔

"اقبال اور ملاّ" کی تردید "اقبال اور مسٹر" کے ذریعہ کی گئی۔ اس میں علامہ اقبال
کے ارشادات سے ثابت کیا گیا کہ وہ علماء کرام کو اسلام کی قوتِ عظیم کے لئے سرچشمہ
سمجھتے تھے۔ اسے سرتیب پہ جاری رکھنا چاہتے تھے۔ مسٹر طبقہ کو اسی چشمہ سے
فیض حاصل کرنے کی ترغیب دیتے تھے اور خود بھی اسی چشمہ کے فیضیافتہ تھے۔

اس رسالہ کی اشاعت سے نہ صرف علامہ اقبال کے مذہبی اور دینی عقائد تفصیل
کے ساتھ منظرِ عام پر آگئے بلکہ ان کے دوست نما دشمن بھی بے نقاب ہو گئے ان
کے ڈھول کا پول کھل گیا اور عوام و خواص نے اس حقیر کوشش کو بنظرِ استحسان
دیکھا۔ اور رسالہ کا پہلا ایڈیشن ہفتوں میں ختم ہو گیا۔

دوسرے ایڈیشن کے لئے اضافہ کا کام جاری تھا کہ خبر ملی۔ کہ اقبال کی آڑ میں
بلکہ اس کے نام پر انکارِ حدیث اور تذلیلِ علماء کرام کی جو تحریک چلائی جا رہی تھی۔
اس کا ابطال چونکہ اب خود علامہ اقبال کے قول و کردار سے کیا جا رہا ہے۔ اس

لئے مسٹر پرویز نے کلامِ اقبال کی اہمیت و افادیت کو گرانے کی کوشش شروع کر دی ہے۔

مثنوی اسرارِ خودی میں علامہ اقبال نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک معجزہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو ستونِ حنانہ کے متعلق ہے اور لکھا ہے کہ :۔

من چہ گویم از تولائش کہ چیست
خشک چوبے در فراقِ او گریست

اس شعر پر تبصرہ کرتے ہوئے کراچی سے طلوع ہونے والے اسلام کا داعی رقمطراز ہے کہ :۔

"اس واقعہ کو مولانا روم نے اپنی مثنوی میں بیان کیا ہے لیکن قرآنی نقطہ نگاہ سے یہ صحیح نہیں۔ بہر حال اقبال نے اس سے شاعرانہ فائدہ اٹھایا ہے۔ شاعر کو مروجہ روایات کی تحقیق سے غرض نہیں ہوتی۔ وہ انہیں علی حالہ لے لیتا ہے۔ اور اس سے اپنے مطلب کا نتیجہ اخذ کر لیتا ہے یہ شاعری کا بنیادی نقص بھی ہے۔ انسان کسی بات کو نثر میں پیش کرے یا نظم میں۔ اسے کسی صورت میں حقائق سے الگ نہیں ہونا چاہیئے"
(طلوع اسلام ۵ نومبر ۱۹۵۵ء)

حالانکہ علامہ اقبال کا مذکور الصدر شعر قرآنی نقطہ نظر سے بھی بالکل صحیح ہے۔ اگر قرآن کی رو سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا عصا سانپ بن سکتا ہے اور جادو کے دوسرے سانپوں کو نگل سکتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارۂ انگشت پر چاند دو ٹکڑے ہو سکتا ہے اور دُنیا کو حیرت میں ڈال سکتا ہے اگر شجر و حجر آفتاب و ماہتاب ستارے اور سیارے خدا کو سجدہ کر سکتے ہیں۔ تو کیا ایک چوبی ستون اس فخر موجودات رحمۃ اللعالمین ؐ کے فراق میں گریہ نہیں کر سکتا۔ جس کے ساتھ حضور ٹیک لگا کر خطبہ پڑھا کرتے تھے۔ کیا یہ محرومی معمولی چیز ہے؟ اور جب اس واقعہ کی تائید میں گیارہ صحابی متفق البیان ہوں۔ تو کیا وجہ ہے کہ اس صادق القول گروہ کی بات نہ مانی جائے اور اس کے قول کو صحیح تسلیم کیا جائے۔ جس کا کام ہی ہر اس حقیقت کو جھٹلانا ہے جسے اس کی عقل قلیل احاطہ نہیں کر سکتی۔

محض اپنے ادعا و افترا کو صحیح جتانے کے لئے شاعر اسلام علامہ اقبال کو حقائق ناآشنا بے تحقیق اور پابند روایات شاعر قرار دینا، اقبال پر تیسرا ظلم عظیم ہے اور نہ معلوم یہ مار آستین ابھی اس پر اور کیا کیا ظلم کرے گا۔ اقبال کے ساتھ جو ظلم ہونے والا تھا۔ وہ فراستہً ان پر ظاہر ہو چکا تھا۔ اور غالباً ایسے ہی ظالموں کی طرف انہوں نے اشارہ بھی کیا تھا کہ:۔

(الف) ہر شخص ہر کتاب کو اپنے خیالات کی روشنی میں پڑھتا ہے اور اس کے مضامین سے وہی نتائج نکالتا ہے۔ جن کی اس کی دماغی تربیت مقتضی ہوتی ہے۔" (ہمایوں، دیباچہ)

(ب) "میں تو ایک معمولی آدمی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی دوبارہ پیدا ہو کر اس ملک میں اسلام کی تعلیم دیں۔ تو غالباً اس ملک کے لوگ اپنی موجودہ کیفیات اور اثرات کے ہوتے ہوئے حقائق اسلامیہ کو نہ سمجھ سکیں"۔ (ایضاً صد ۵۳)

اقبال کا نام۔ کام اور پیغام ایک قومی سرمایہ ہے۔ اس کا ضیاع یا اس کی تحقیر و تذلیل کسی قیمت پر برداشت نہیں کی جا سکتی۔ اقبال خواہ حلقوں کو اقبال کے مذہبی خیالات، دینی عقاید اور اسلامی تعلیمات سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ صرف اس کی شاعری کے شیدا ہیں۔ اس لئے انہوں نے اقبال پر پے درپے کئے جانے والے ظلم پر کبھی احتجاج نہیں کیا مگر عامۃ المسلمین کو اپنا فرض نہیں بھولنا چاہئے۔ انہیں چاہیئے۔ کہ وہ اس محسن ملت کو اس ظلم سے بچائیں۔ اور اس رسالہ کو ہر پڑھے لکھے انسان تک پہنچا کر دشمنانِ اسلام اور دشمنانِ اقبال کی ناپاک کوششوں کو ناکام بنائیں تاکہ علامہ اقبال کی روح تسکین و تمکین حاصل کر سکے۔

چہلیک۔ ملتان شہر	احقر العباد
۲۵ ر نومبر ۱۹۵۵ء	منشی عبدالرحمٰن خاں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقبالؔ اور مسٹر

پس منظر

ہمہ دانی تعصب اور عقیدت کے پردے بسا اوقات انسان کی نظر حقیقت تک نہیں پہنچنے دیتے۔ وہ اپنے تخیلات و توہمات پر جو نظریات قائم کرتا ہے۔ انہیں ہی حقائق و معارف کا درجہ دینے لگتا ہے حالانکہ حقیقت اکثر اس کے برعکس ہوتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ:۔

"اکثر انسانوں کو کنجِ تنہائی میں بیٹھے ہمہ دانی کا دھوکہ ہو جاتا ہے۔ ان کا قصور نہیں۔ فطرتِ انسانی ہی اسی قسم کی ہے۔"

(اقبال نامہ صہ ۱۱)

پست فطرتی | پھر ان سے ابتر حالت ان تہذیب یافتہ لوگوں کی ہے۔ جنھوں نے اسلامی ماحول کی بجائے انگریزی ماحول میں غلامانہ حیثیت سے تعلیم و تربیت پائی ہے۔ وہ اسلام کو کتاب و سنت کی عینک سے دیکھنے کی بجائے اسلام دشمن اقوام کے لٹریچر اور ان کی تہذیب و تمدن کے آئینہ میں دیکھنے کے نہ صرف عادی ہو چکے ہیں۔ بلکہ اسے حرفِ آخر بھی سمجھتے ہیں۔ اسی طبقہ کا حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اپنے مکاتیب میں اکثر ان الفاظ میں شکوہ کیا ہے کہ :۔

"مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے (ایضاً ص ۱۴۹)

مغربی کالجوں کے پڑھے ہوئے مسلمان نوجوان روحانی اعتبار سے کتنے فرومایہ ہیں کہ ان کو معلوم نہیں کہ اسلامیت کیا ہے۔ اور وطنیت کیا چیز ہے (ایضاً ص ۲۹۲)

غلام قوم مادیات کو روحانیات پر مقدم سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے۔ تو ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے۔ جس کا مقصد قوتِ نفس اور روحِ انسانی کا ترفع ہو۔ (ایضاً ص ۲۰۲)

اضطرابِ اقبالؒ | یہی وہ حالات تھے۔ جنھوں نے اس نباضِ امت کو

مضطرب کر رکھا تھا جس کا انہوں نے مورخ اسلام علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نام ایک خط میں یوں اظہار کیا:۔

"میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میرے دل میں ممالکِ اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ ذاتی لحاظ سے خدا کے فضل و کرم سے میرا دل پورا مطمئن ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کر لے۔ حال ہی میں ایک تعلیم یافتہ عرب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ فرانسیسی خوب بولتا تھا۔ مگر اسلام سے قطعاً بے بہرہ تھا۔ اس قسم کے واقعات مشاہدہ میں آتے ہیں تو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ (ایضاً صـ۱۵۵)

وہ اپنے مشاہدہ کی بنا پر سید صاحب کے نام ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ

"میں دیکھتا ہوں کہ اسلامی ممالک میں عوام اور تعلیم یافتہ لوگ دونوں طبقے علوم اسلامیہ سے بے خبر ہیں" (ایضاً صـ۱۴۲)

انٹی مُلا فرنٹ

عوام اور تعلیم یافتہ لوگوں کی علوم اسلامیہ سے بے خبری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مغرب زدہ گروہ کے قائد مسٹر پرویز نے تجدید اسلام کی تحریک شروع کی۔ اسی غرض کے لئے دوسری تحریک

مودودی صاحب نے جماعت اسلامی کے نام سے شروع کی۔ اور دونوں تحریکیں اسلام اور قرآن کے نام پر چلائی گئیں۔ مودودی صاحب نے اعلان کیا کہ :-

"ہم عین اسلام اور اصل اسلام کو لے کر اٹھ رہے ہیں اور پورا کا پورا اسلام ہی ہماری تحریک ہے" (روئیداد جماعت اسلامی حصہ اول ص۵)

اور مسٹر پرویز کے "صحیفہ" طلوع اسلام نے اپنا مسلک و مقصد یہ پیش کیا کہ

"ہمارا مقصد یہ ہے کہ ابتداً پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں قرآنی نظام ربوبیت نافذ ہو جائے"۔ (طلوع اسلام مارچ ۱۹۵۵ء ص ق)

چونکہ دونو تجدد کی راہ چل رہے تھے اور دنیا کے سامنے نبوی اسلام کی بجائے اپنا اسلام پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے صاف کہہ دیا کہ ہماری "ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہوگی۔ مودودی صاحب نے فرمایا کہ :-

"ہمارا راستہ سب گروہوں سے الگ ہے اور ہم مجبور ہیں کہ اس سے اختلاف کریں اور ان کے علی الرغم اپنے مسلک کی تبلیغ کریں"۔

(جماعت اسلامی ص۱۶)

اور مسٹر پرویز نے لکھا کہ :-

"میری دعوت لوگوں کے ساتھ ساتھ چلنے کی نہیں۔ بلکہ انہیں ان

کی موجودہ روش سے الگ کرکے دوسری راہ پر لے جانے کی ہے۔

(مقام حدیث جلد ۲ صفحہ ۳۱۶)

چونکہ دونوں نے سلف صالحین کی راہ سے ہٹ کر ایسی راہ اختیار کی تھی۔ جو
کتاب وسنت کے خلاف تھی۔ اس لئے علماء کرام نے اپنا فرض منصبی ادا کرتے
ہوئے مسلمانوں کو ان نئے فتنوں سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ جو ان کی طبع نازک
پر گراں گزرا علامہ اقبال کے ارشاد کے مطابق چونکہ

"علماء ہمیشہ سے اسلام کی قوتِ عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں"

(حرف اقبال صفحہ ۱۹۳)

اس لئے دونوں نے اس سرچشمہ کو بند کرنے کے لئے ایک متحدہ محاذ بنا لیا
اور بقول علامہ اقبال ؏ آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
ان کے ساتھ وہ مغرب زدہ مسلمان بھی شریک ہوگئے جو علامہ اقبال کے
کلام کے اس حصہ سے متاثر تھے جس میں انہوں نے جامد مولویوں اور کندہ ناتراش
پیروں کی خبر لی تھی۔ اور اس طرح سب نے مل کر پاکستان میں ایک اینٹی ملا
فرنٹ بنا لیا۔

مطالبہ علماء | جنگِ پاکستان میں علماء اسلام نے قائد اعظم اور دیگر اکابر لیگ

کے اس وعدہ پر شرکت کی تھی کہ پاکستان کا نظام حکومت کتاب و سنت کے مطابق بنایا جائے گا۔ جب ۹ جون ۱۹۴۷ء کو مسلم لیگ کونسل نے ریڈ کلف ایوارڈ کا پیش کردہ پاکستان قبول کر لیا جس میں صوبہ صوبہ سرحد اور سلہٹ شامل نہیں تھا۔ تو ۱۱ جون ۱۹۴۷ء کو علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد عثمانی نے قائد اعظم سے ملاقات کی۔ جس میں دیگر امور کے علاوہ ان صوبوں کے ریفرنڈم کا سوال بھی زیر بحث آیا۔ تو قائد اعظم نے ان حضرات سے درخواست کی کہ یہ دو صوبے پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ آپ اب یہ مہم بھی سر کر کے ان کو پاکستان میں شامل کرائیں۔ انہوں نے فرمایا کہ:-

"ہم انشاء اللہ آپ کو یہ ریفرنڈم جیت دیں گے۔ بشرطیکہ آپ اعلان کر دیں کہ پاکستان کا نظام حیات اسلامی ہوگا۔ کیونکہ فرنٹیر اور بنگال کا مسلمان سیاسی مصالح کو نہیں جانتا۔ وہ صرف اسلام کو جانتا ہے اور اسی نام پر ووٹ دے سکتا ہے۔" (تعمیر پاکستان اور علماء ربانی)

جواب قائدِ اعظم

تو قائد اعظم نے انہیں جواب دیا کہ:-

"مولانا! میں تو اس کا بارہا اعلان کر چکا ہوں اور جب پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی تو وہاں اسلامی دستور کے سوا اور کون سا دستور ہو سکتا ہے؟ آپ بخوشی اپنی تحریر و تقریر میں میرے حوالے

سے اس کا اعلان کرتے ہیں اور ان کو پورا یقین دلائیں کہ میں نے قوم سے کبھی غداری نہیں کی۔ جو میں نے پہلے بار ہا کہا ہے۔ وہ آج بھی کہتا ہوں کہ پاکستان کا نظامِ حیات اسلامی ہوگا۔ اور اس کا دستور کتاب و سنت کے موافق بنے گا۔" (بحوالہ صدر)

احترامِ علماء

چنانچہ ان حضرات نے صوبہ سرحد و سلہٹ میں کام کر کے ریفرنڈم جیت کر پاکستان کو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست اور دنیا کا پانچواں بڑا ملک بنایا۔ اور قائدِ اعظم نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی پرچم کشائی کا اعزاز ان ہر دو حضرات ہی کو بخشا۔ مغربی پاکستان میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اور مشرقی پاکستان میں مولانا ظفر احمد عثمانی نے پاکستان کا پرچم لہرا کر اسے اسلامی ممالک کی برادری میں شامل کرنے کی رسم کا افتتاح کیا۔ قائدِ اعظم اور اربابِ اقتدار کے دل میں ان حضرات کی خدمات کی وجہ سے اتنا احترام پیدا ہو گیا کہ وہ مذہبی امور میں ان سے ہی صلاح و مشورہ کرنے لگے۔ جیسا کہ مورخ اسلام مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے :-

"کراچی پہنچ کر کوئی سرکاری عہدہ حاصل نہیں کیا۔ مگر مذہبی معاملات میں ان کی حیثیت مشیرِ خاص کی تھی۔ اس لئے زبانِ خلق نے ان کو شیخ الاسلام

کہہ کر پکارا۔ اسی حیثیت سے مرحوم پاکستان کی مجلس آئین ساز کے رکن بھی تھے اور اس جماعت کے روح رواں بھی۔ جو اس کے آئین کو اسلامی قالب میں ڈھالنا چاہتی تھی"۔ (یادِ رفتگاں صفحہ ؟)

مخالفتِ علماء علماء کرام کا یہ احترام مودودی صاحب سے نہ دیکھا گیا انہوں نے جب دیکھا کہ عوام علماء کے مطالبہ سے متفق ہیں اور ان کے اصرار پر اربابِ اقتدار آئین اسلامی بنانے کی طرف مائل ہیں تو انہوں نے ان حالات کا فائدہ اٹھانے کے لئے بظاہر تو اپنے پریس اور پلیٹ فارم سے عوام و علماء کے مطالبہ کی پرزور تائید شروع کردی۔ مگر بہ باطن پاکستان کے مختارِ مطلق اور شیخ الاسلام بننے کے لئے صالحین کی فوج تیار کرنی شروع کردی انہیں تربیت دینے کے لئے تربیتی کیمپ قائم کئے گئے اور یہ سبق پڑھایا جانے لگا کہ:۔

لہ حسنِ اتفاق سے ایک زیرِ تربیت جماعت کا کیمپ ہمارے مکان کے قریب ہی واقع تھا۔ جس کے ارکان ہماری مسجد میں آکر نماز پڑھتے تھے اور ان کے امیر نے راقم کو اپنا ہم خیال تصور کر کے یہ راز فاش کیا۔ جس کی تائید دوسرے ذرائع سے بھی ہوئی۔ اور جس کی تصدیق جماعت اسلامی کے ماہنامہ 'چراغِ راہ' کے مقالوں اور مودودی صاحب کی تقاریر لاہور، سرگودھا اور ان کے رسالہ خطبات کے صفحہ ۲۰۲ و ۲۰۵ سے ہوتی ہے۔

(الف) آپ نے صالح نظام قائم کرنے کے لیے اربابِ اقتدار کو ان کرسیوں
سے ہٹانا ہے اور حکومت کا کاروبار سنبھالنا ہے اور اس غرض کے لیے
(ب) آپ کو ان مولویوں کو بھی مسجدوں سے نکال کر ان پر قبضہ جمانا ہے
اور عوام سے رابطہ بڑھانا ہے۔

اُدھر مغرب زدہ مسلمانوں نے علماءِ کرام کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے اپنا
مستقبل خطرہ میں سمجھا۔ اور انہوں نے اخبارات و رسائل میں علماءِ کرام کے خلاف
ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ اور اربابِ اقتدار کو اپنے مفروضہ خدشات پیش کر کے
آئینِ اسلامی کی مخالفت پر آمادہ کرنے لگے۔ اور اپنے خود ساختہ دستوری خاکوں
کو منظور کرنے کی ترغیب دینے لگے۔

اقبالؔ اور مُلّا

غرضیکہ جس طرح متحدہ ہندوستان میں مختلف ہندو جماعتوں
نے مسلم کشی کے سوال پر اندرونی طور پر اتحاد کیا ہوا تھا
اسی طرح پاکستان میں علماءِ اسلام کے اثر و رسوخ کو جنہیں علامہ اقبالؒ "اسلام
کی قوتِ عظیم کا سرچشمہ" قرار دیتے ہیں ختم کرنے کے لئے مختلف الخیال جماعتوں نے
متحدہ محاذ بنا لیا۔ اس محاذ کی نمائندگی کرتے ہوئے جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب
ایم۔اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے ایک رسالہ "اقبال اور مُلّا" کے نام سے لکھ کر "بزمِ اقبال"

لاہور کی طرف سے شائع کیا - اور علامہ اقبال کے کندھے پر بندوق رکھ کر علمائے کرام کو نشانہ ستم بنانا شروع کر دیا۔

تبصرۂ ماجد

اس رسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی نے لکھا کہ :-

"اس رسالہ میں حضرت اقبال کے وہ سارے شعر اپنے تبصرہ و تحشیہ کے اضافہ کے ساتھ اکٹھے کر دیئے گئے ہیں جو انہوں نے ملا کے ہجو و تفضیح میں کہے ہیں۔ اور اس طرح جو "اینٹی ملا فرنٹ" پاکستان میں قائم ہوا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک زبردست حربہ دے دیا گیا ہے۔ یہ اشعار یقیناً علامہ اقبال ہی کے ہیں۔ خلیفہ صاحب یا کسی اور کے گھڑے ہوئے نہیں۔ تاہم انہیں ان کے سیاق سے الگ کر کے نمک مرچ لگا کر ایک جگہ جمع کر دینے سے پڑھنے والے پر جو اثر پڑتا ہے وہ ہرگز وہ نہیں۔ جو اصلی کلام اقبال کے مجموعہ کے پڑھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے یہ طریق انتخاب و تدوین نہ زیادہ ذمہ دارانہ ہے اور نہ پوری طرح دیانتدارانہ اور پھر اس کی اشاعت بجائے کسی فرد واحد کے ایک نیم سرکاری ادارہ کی طرف سے

ہونا تو اور بھی غضب کی بات ہے۔

اقبال نے بیشک "ملاّ" پر نکتہ چینی کی ہے لیکن ملاّ سے ہمیشہ ان کی مراد "کٹھ ملا" سے ہے اور پھر ایسی ہی نکتہ چینی بلکہ شاید اس سے بھی شدید انہوں نے تہذیب جدید کے فرزندوں پر بھی تو کی ہے اب کوئی منچلا اگر یہ کرے کہ "اقبال اور مسٹر" کے عنوان سے اس آخری قسم کا سارا کلام اپنے حاشیوں کے ساتھ اکٹھا کر دے تو خلیفہ صاحب کیا رائے اس کے متعلق قائم کریں گے۔

(صدق جدید ۱۷ جون ۵۵ء)

واقعاتی جواب

جائزہ پیشتر اس کے کہ "اقبال اور ملا" کا الزامی جواب دیا جائے یہ کیوں نہ دیکھا جائے کہ خلیفۂ اقبال نے علماء دشمنی کے سلسلہ میں جو باتیں علامہ اقبال سے منسوب کی ہیں۔ علامہ اقبال کے فرمودات اور دوسرے واقعات ان کی تائید بھی کرتے ہیں یا نہ؟

زیر بحث رسالہ "اقبال اور ملا" کے مصنف ماشاء اللہ ایم اے پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ ماہوار رسالہ "ثقافت" کے ایڈیٹر ہیں "بزم اقبال" کے مدار المہام ہیں۔ اس لاکمشن کے ممبر بیان کئے جاتے ہیں۔ جو حکومت کی طرف سے موجودہ قوانین کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے اور ادارہ ثقافت اسلامیہ

کے معدرہیں۔ اس لئے خیال یہ تھا کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہوگا اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے سوچ سمجھ کر صحیح لکھا ہوگا۔ مگر تحقیق و تفتیش کے بعد ثابت ہُوا کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے واقعی وہ بقول مولانا عبدالماجد صاحب "نہ ذمہ دارانہ ہے اور نہ دیانتدارانہ" بلکہ جس طرح مقام جنون پر پہنچنے کے بعد عاشق کو کائنات کی ہر چیز میں معشوق کی تصویر نظر آنے لگتی ہے۔ اسی طرح "اینٹی ملا فرنٹ" پر کھڑے ہونے کے بعد یہ بھی نیک و بد۔ حق و باطل۔ صحیح و غلط اور جائز و ناجائز میں تمیز نہیں کر سکے۔ اس محاذ پر پہنچنے کے بعد ان کے تدبر اور تخیل میں ایک ایسا تغیر پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اقبال کے اسس ارشاد کا مظہر ہو کر رہ گئے ہیں کہ:۔

حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا

رقابت ۔ خود فروشی ۔ ناشکیبائی ۔ ہوسناکی

مسٹر کا پہلا وار

خلیفہ صاحب نے بلا استثنار سب علماء کرام کے متعلق یہ فتوےٰ دیا ہے کہ:۔

"اقبال نے دیکھا کہ مدعیانِ دین اور حامیان شرع متین میں نہ افکار کی بلندی ہے نہ حوصلہ مندی نہ دل بیتاب ہے اور نہ مشرب ناب نہ دل گرم ہے اور نہ نگاہ پاک۔ تو اس نے اس طبقہ کو دین کے لئے ایک

خطرہ سمجھا؟ (اقبال اور مُلاّ صفحہ ۴)

افسوس کہ خلیفہ صاحب نے "اقبال نے دیکھا" لکھ کر کوئی اخلاقی جرأت نہیں دکھلائی۔ بلکہ عوام و خواص کے دلوں میں علامہ اقبال کی جو قدر و منزلت اور محبت و عقیدت ہے۔ خلیفہ صاحب نے اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی غرض سے انہیں فریب دینے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ علامہ اقبال خلیفہ صاحب کی طرح سب کو ایک نظر سے دیکھنے کے عادی نہ تھے اور نہ ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا جانتے تھے۔ بلکہ وہ تو اپنے کلام میں نیک و بد اور حق و باطل کا واضح فرق بتلاتے تھے۔ خلیفہ صاحب کو اگر علماء کرام میں کوئی خوبیاں نظر نہیں آسکیں۔ جس کی وجہ سے وہ انہیں دین کے لئے خطرہ قرار دیتے ہیں۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ علامہ اقبال کو بھی کچھ نظر نہ آتا تھا۔

سرچشمۂ اسلام! علامہ اقبال علماء کرام کو دین کے لئے خطرہ کی بجائے انہیں اسلام کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔ جیسا کہ ان کے ارشاد سے ظاہر ہے کہ

"علماء ہمیشہ اسلام کے لئے ایک قوت عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں"

(حرف اقبال صفحہ ۱۶۳)

انہوں نے یہ فیصلہ خلیفہ صاحب کی طرح سُنی سُنائی باتوں پر نہیں دیا تھا بلکہ

اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر دیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ :۔

"مَیں نے اپنی زندگی کا زائد حصّہ اسلام اور اسلامی فقہ و سیاست
تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔"

(حرفِ اقبال ص)

اس مطالعہ کے دوران میں انہیں اکثر بزرگانِ دین اور علماء کرام کی طرف رجوع کرنا پڑا جیسا کہ اقبال نامہ کے مکاتیب سے ظاہر ہے۔ اس لئے وہ اپنی تمام بصیرت و فراست کو علماء حق کا ہی فیض سمجھتے تھے۔ چنانچہ شمس العلماء میر حسن مرحوم و مغفور جن کے ساتھ علامہ اقبال کے خصوصی نیاز مندانہ اور شاگردانہ تعلقات تھے کے فیضِ صحبت اور نظر کیمیا اثر کا انتہائی عقیدت مندانہ اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ؎

وہ شمع بارگہِ خاندانِ مرتضوی | رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی | بنایا جس کی مروّت نے نکتہ داں مجھ کو

اسی طرح انہوں نے اشرف العلماء حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے محبوب وارشد مجاز مورخ اسلام علامہ سید سلیمان ندویؒ سے جو فیض حاصل کیا۔ اس کا وہ سید صاحب کے نام اپنے مکتوبات میں یوں اعتراف کرتے ہیں کہ :۔

(۱) علومِ اسلام کی جوئے شِیر کا فرہادِ آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے؟ (اقبال نامہ صـــ۱۶۶)

(۲) آپ کا نوازش نامہ قوتِ روح اور اطمینانِ قلب کا باعث ہوا۔ (اقبال نامہ صـــ۸۵)

(۳) (آپ کا) "معارف" ایک ایسا رسالہ ہے۔ جس کے پڑھنے سے حرارتِ ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔ (ایضاً صـــ۸۵)

(۴) سیرۃ عائشہ کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ یہ ہدیہ سلیمانی نہیں۔ سرمۂ سلیمانی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا۔ خدا تعالےٰ جزائے خیر دے (ایضاً صـــ۱۱۳)

(۵) آج کے "معارف" میں میری آرزو سے بڑھ کر مضمون لکھا گیا۔ جزاک اللہ معارف کا ایڈیٹر صاحب کشف نہ ہوگا۔ تو اور کون ہوگا۔ (ایضاً صـــ۱۱۸)

(۶) نوازش نامہ ابھی ملا۔ جس کے لئے بہت شکر گذار ہوں۔ جتنی آگاہی آپ نے دیدی ہے۔ وہ اگر زمانہ فرصت دے۔ تو باقی عمر کے لئے کافی ہے۔ (ایضاً صـــ۱۲۲)

(۷) آپ اپنے نوازش نامہ کی طوالت کے لئے عذر خواہی کرتے ہیں۔
مگر میرے لئے یہ طویل خط باعث خیر و برکت ہے اللہ تعالیٰ آپ کو
جزائے خیر دے۔ میں نے اسے کئی دفعہ پڑھا ہے اور گذشتہ رات
چوہدری غلام رسول مہرؔ سے بھی پڑھوا کر سنا اور احباب بھی اس مجلس
میں شریک تھے۔ اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی۔ جس قدر آپ کی
ہے۔ تو مجھے یقین ہے کہ میں اسلام کی کچھ خدمت کر سکتا۔ فی الحال
انشاء اللہ آپ کی مدد سے کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ (ایضاً صفحہ ۱۵۱)

(۸) خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے آپ
کو صحت عطا فرمائی۔ آپ کا وجود ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے
از بس ضروری ہے اور مجھے یقین ہے کہ خدا تعالےٰ نے مسلمانوں کی
دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا ہے۔ تاکہ وہ دیر تک آپ کے علوم سے مستفیض
ہوتے رہیں۔" (ایضاً صفحہ ۱۹۷)

علامہ اقبال کے ان واضح اعترافات کی روشنی میں یہ کہنا کہ وہ مدعیانِ دین اور
حامیانِ شرع متین کو دین کے لئے ایک خطرہ سمجھتے تھے۔ یا یہ کہنا کہ:۔
"علامہ اقبال کا تجربہ تھا کہ ملا تنگ دل ہوتا ہے۔ اور لطیف افکار و جذبات

اس کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔" (اقبال اور ملا صفحہ ۲)

علامہ اقبال پر ایک بہتان نہیں تو اور کیا ہے۔ علامہ اقبال محسن ناشناس یا محسن کش نہ تھے۔ جیسا کہ خلیفہ صاحب انہیں سمجھ رہے ہیں یا دنیا پر ظاہر کر رہے ہیں۔

مسٹر کا دوسرا الزام

خلیفہ صاحب علماء اسلام پر دوسرا الزام یہ عاید کرتے ہیں کہ:-

"ایسے لوگوں کو جب بھی سوجھے گی۔ کوئی ادنیٰ بات ہی سوجھے گی کسی بلند مقصد کے لئے قربانی تو در کنار وہ مقصد ہی ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ چنانچہ تاسیس پاکستان کی جدوجہد میں اس کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا ... ملا کو اسلامی مملکت کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اس کا تصور ایک نئے نواز صاحب دل نے پیش کیا۔" (اقبال اور مُلّا صفحہ ۴)

سعادت عظمیٰ

اوّل تو یہ بات غلط ہے کہ ان حضرات کو ادنیٰ باتیں سوجھتی ہیں۔ اگر ادنیٰ باتیں سوجھتی ہوتیں۔ تو علامہ سید سلیمان کا صرف ایک خط علامہ اقبال اپنی بقایا ساری عمر کے لئے کیسے کافی سمجھتے۔ یا ان کے ایک خط کو کئی کئی بار کیوں پڑھتے۔ اور ان کا وجود ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ضروری کیوں سمجھتے۔

باقی رہا اسلامی مملکت کے تصور کا سوال۔ تو خواجہ صاحب کو شاید علم نہیں کہ اسلامی سلطنت کا تصور سب سے پہلے "نئے نواز صاحب دل اقبال" نے پیش نہیں کیا۔ بلکہ جن علماء کرام اور بزرگانِ دین کے فیض نے علامہ اقبال کو "نئے نواز صاحب دل" بنایا تھا۔ انہی کے امیر و رئیس حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ نے پیش کیا تھا۔ اور اس وقت پیش کیا تھا جبکہ ابھی علامہ اقبال کو اس کا خواب وخیال بھی نہ تھا۔ مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی نے اپنے چند بزرگوں کی معیت میں جون ۲۰ء میں جب حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے تھانہ بھون میں شرفِ ملاقات حاصل کیا تھا۔ تو اس وقت حضرت تھانوی نے ان کے روبرو تخیلِ پاکستان پیش کیا تھا۔ چنانچہ اس ملاقات کی روئیداد میں مولانا دریا بادی لکھتے ہیں کہ:۔

"پاکستان کا تخیل، خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں پہلے پہل اس قسم کی آواز یہیں کان میں پڑی۔"

(حکیم الامت صـ۴۳)

حضرت تھانوی نے تو دینی تقاضوں کے ماتحت اسلامی سلطنت کی ضرورت محسوس کی تھی۔ مگر اس کے اڑھائی سال بعد علامہ اقبال نے سیاسی ضرورتوں کے ماتحت صرف اسلامی سلطنت کا مطالبہ کیا تھا۔ نظامِ سلطنت کا اس وقت کوئی خاکہ

پیش نہیں کیا تھا۔ مگر حضرت تھانوی نے اسلامی سلطنت کے تخیل کے ساتھ اس کے نظامِ حکومت کا خاکہ بھی پیش کر دیا تھا۔ کہ وہ :-

"خالص اسلامی حکومت ہو۔ سارے قوانین تعزیرات وغیرہ کا اجرار احکامِ شریعت کے مطابق ہو۔ بیت المال ہو۔ نظامِ زکوٰۃ رائج ہو۔ شرعی عدالتیں قائم ہوں۔ وقس علی ہذا۔" (سیرتِ اشرف)

اس لئے "اسلامی سلطنت کی ضرورت کا احساس" سب سے پہلے علامہ اقبال کے دل میں پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ اشرف العلماء حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ گویا یہ سعادتِ عظمیٰ ایک مُلّا کے حصّہ میں آئی تھی نہ کہ مسٹر کے۔

تصدیق رحمٰن | پاکستان کے ابتدائی تخیل پر ہمارا مقالہ (جو "سیرتِ اشرف" کا ایک باب ہے) جب عدالت عالیہ ہائیکورٹ لاہور کے چیف جسٹس عالیمرتبت جناب ایس اے۔ رحمٰن صاحب کی نظر سے گذرا۔ تو انہوں نے اس امر کی تصدیق فرمائی کہ واقعی مفکرِ پاکستان علامہ اقبال نہیں بلکہ حضرت تھانویؒ تھے۔ جیسا کہ ان کے اس مکتوب گرامی سے ظاہر ہے۔

"مکرمی۔ السلام علیکم۔ آپ کا مضمون دیکھا۔ آگہی افروز پایا۔ فرداور

ملت کی ہیئت سے متعلق مستقل مثنویاں تو علامہ اقبال پہلے بھی لکھ
چکے تھے۔ یعنی اسرار خودی اور رموز بیخودی جو ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۸ء میں
شائع ہوئیں۔ لیکن پاکستان کا سیاسی تخیل ان کی تحریرات میں بعد میں آیا۔
اور آپ کا مضمون بہت دلچسپ پایا۔" مخلص ایس۔ اے رحمٰن

جہاں تک علماء کی قربانیوں کا تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں بھی خلیفہ صاحب
یا بے خبری میں یا تجاہل عارفانہ فرما رہے ہیں۔ اگر وہ دنیا سے یہ راز چھپانا چاہتے
ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرے لوگ بھی مولانا مظہرالدین ایڈیٹر الامان
دہلی کی شہادت کو بھول گئے ہوں گے جو مسلم لیگ کی حمایت کے جرم میں شہید
کر دیئے گئے تھے اور نہ ہی وہ ان پانچ سو علماء کی قربانی بھول سکتے ہیں۔ جو بقول
علامہ شبیر احمد عثمانی ریفرنڈم کے دوران میں کانگرسی حکومت نے گرفتار کیے اور
جنہوں نے پاکستان کی حمایت کرنے میں دوسرے لیڈروں سے زیادہ سختیاں
برداشت کیں۔

ان حالات میں یہ الزام کہ

"ایسے لوگوں کو جب بھی سوجھے گی۔ کوئی ادنیٰ بات ہی سوجھے گی۔ کسی
بلند مقصد کے لئے قربانی تو درکنار وہ مقصد ہی ان کی سمجھ میں نہ آئے گا"

"ملّا" پر عاید ہوتا ہے؟ یا سو فیصدی "مسٹر" پر! جو حقیقت پر پردہ ڈال کر مدعی کو مجرم ثابت کر رہا ہے۔

مسٹر کا تیسرا بہتان

خلیفہ صاحب علماء اسلام پر بلا استثنار تیسرا بہتان یہ لگاتے ہیں کہ:۔

"علامہ (اقبال) نے پاکستان کا تصور پیش کیا اور ملت اسلامیہ کے لئے سیاسی استقلال اور آزاد سلطنت کے طالب ہوئے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا۔ کہ اہل دین سب سے آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کرتے لیکن علماء میں بڑے بڑے اکابر نے اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا" (اقبال اور ملا صٓ)

اس سلسلہ میں بھی خلیفہ صاحب کا بیان حقیقت سے بعید ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب یا تو جہادِ پاکستان کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں یا بالکل غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ کی آزاد سلطنت کا اہل دین نے سب سے آگے بڑھ کر خیر مقدم نہیں کیا۔ کیونکہ اہل دین نے اس کا خیر مقدم اس وقت سے شروع کر دیا تھا۔ جبکہ ابھی مسلم لیگ نے مارچ ۱۹۴۰ء کا پاکستان ریزولیوشن پاس ہی نہیں کیا تھا۔

خیر مقدم پاکستان یا اسلامی سلطنت کی خواہش اوّلین چونکہ مجددِ وقت حضرت تھانویؒ نے پیش کی تھی۔ اس لئے حق تعالےٰ نے اپنے اس نیک بندہ کی خواہش قبول فرمائی اور حضرت تھانویؒ کو فراستؓ معلوم ہو گیا کہ ان کی خواہش کے مطابق پاکستان بن کے رہے گا۔ اور کہ اس کی باگ ڈور مسٹر محمد علی جناح کے ہاتھ میں آئے گی۔ جن کی زندگی سراپا مغربی سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے اور جو مذہب کو سیاست سے بالکل الگ سمجھتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے مئی سنہ ۳۰ء میں تھانہ بھون کے رئیسِ اعظم۔ خانقاہ امدادیہ کے مہتمم اپنے برادر زادہ مولانا شبیر علی صاحب تھانوی کو بلایا اور ان سے فرمایا کہ:۔

"میاں شبیر علی ہوا کا رخ بتا رہا ہے کہ لیگ والے کامیاب ہو جائیں گے اور بھائی جو سلطنت ملے گی وہ ان ہی لوگوں کو ملے گی۔ جن کو آج سب فاسق فاجر کہتے ہیں۔ مولویوں کو تو ملنے سے رہی لہٰذا ہم کو یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ یہی لوگ دیندار بن جاویں اور بھائی آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ اگر سلطنت مولویوں کو مل بھی جائے۔ تو شاید مولوی چلا بھی نہ سکیں۔ یورپ والوں سے معاملات۔ ساری دنیا سے جوڑ توڑ ہمارے بس کا کام نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ سلطنت کرنا دنیاداروں ہی کا

کام ہے مولویوں کو یہ کرسیاں اور تخت زیب بھی نہیں دیتا۔ تو اگر ہماری
کوشش سے یہ لوگ دیندار اور دیانتدار بن گئے۔ اور پھر سلطنت
ان ہی کے ہاتھ میں رہی۔ تو چشم ما روشن دل ما شاد کہ ہم خود سلطنت
کے طالب ہی نہیں۔ ہم کو تو صرف یہ مقصود ہے کہ جو سلطنت قائم ہو
وہ دیندار اور دیانتدار لوگوں کے ہاتھ میں ہو اور بس تاکہ اللہ کے
دین کا بول بالا ہو۔" (تعمیر پاکستان اور علماء ربانی)

اس نشست میں معمار پاکستان کی سیرت کی تعمیر کے لئے ان کی خدمت
میں تبلیغی وفد بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ قائداعظم اور اکابر لیگ کو تبلیغ کرنے کی غرض
سے مجلس دعوۃ الحق" قائم کی گئی اور پاکستان ریزولیوشن پاس ہونے سے
پہلے پہلے تبلیغی وفود بھیج کر قائداعظم کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا گیا
وہ مسنون طریقہ سے پنج وقتہ نماز پڑھنے لگے۔ ان پر خشیت الٰہی کا غلبہ رہنے
لگا۔ انہوں نے قرآن کا مطالعہ شروع کر دیا۔ انگریزی وضع قطع بدل کر اسلامی
وضع اختیار کر لی۔ اور پاکستان کا دستور کتاب و سنت کے مطابق بنانے کا دعوےٰ
کرنے لگے۔ اور اس طرح اہل دین کی مساعی جمیلہ سے مغرب زدہ جناح مومن کامل بن
گیا جس کی تفصیل ہماری جدید کتاب "تعمیر پاکستان اور علماء ربانی" میں دیکھی جا
سکتی ہے یہ اہل دین کی طرف سے اسلامی سلطنت کا پہلا عملی خیر مقدم تھا۔ اگر

۱۹۴۷ء دیں اس وقت یہ تحریک نہ کرتے۔ تو آج خلیفہ صاحب کو انٹی ملا فرنٹ کے لئے کتابیں لکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔ کیونکہ قائداعظم دین اسلام کے بنیادی اصولوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے فرانسیسی آئین کا خاکہ ذہن میں لئے پھرتے تھے۔ اور ان کے ذہن میں اسلامی دستور کا کوئی تصور ہی نہیں تھا اور یہی انٹی ملا فرنٹ والوں کی اولیں خواہش تھی کہ پاکستان میں اسلامی آئین سرے سے نافذ ہی نہ ہو۔ اور اگر نافذ ہو تو اس اسلامی حکومت کی باگ ڈور مولویوں کے ہاتھ میں نہ آئے۔ بلکہ مودودیوں کے ہاتھ میں آئے۔ آج اگر خلیفہ صاحب کے بھائی بند علماء اسلام کے اثر و رسوخ کو مٹانے اور قائداعظم کے اصولوں کو بھلانے کے درپے ہیں تو محض اس لئے کہ انہوں نے ہی اسلامی آئین کے بنانے کے وعدہ کر کے مغرب زدہ لوگوں کے مستقبل کو خطرہ میں ڈالا ہے۔

ٹائمز کا تبصرہ اسی لئے ٹائمز آف کراچی مغرب زدہ مسلمانوں کے رجحانات کو پاکستان کے لئے حقیقی خطرہ خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"سب سے پہلا رجحان جو ہم میں ابھر رہا ہے۔ وہ قائداعظم کی مخالفت کا ہے۔ احسان فراموشی اور محسن ناشناسی کی حد ہے کہ چھ سال کی قلیل مدت

میں ہی قائداعظم کی یاد ہمارے دلوں سے محو ہونا شروع ہو گئی ہے۔ ہم نے ان کی یاد منانے کا کوئی بندوبست نہیں کیا۔ نہ ان کی یادگار قائم کی۔ نہ ان کے کارناموں پر کتابیں لکھیں اور نہ کسی اور مناسب طریق سے ان کی یاد کو تازہ رکھا۔ اس کی ذمہ داری بلاشبہ ہمارے حکمرانوں پر عاید ہوتی ہے اس عدم توجہی اور بے نیازی کے صدقے میں بعض ایسے حلقوں میں قائداعظم سے ایک طرح کی عداوت تک کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔" (منقول از نوائے وقت ۲۲ مئی ۵۹ء)

اس کے ساتھ ہی ٹائمز آف کراچی نے اینٹی ملا فرنٹ کو بھی ملک کے لئے ایک خطرہ بتایا اور لکھا کہ

"ملا کو گالی دینا اسلام کی خدمت نہیں نہ اس سے اسلام سمجھا ہی جا سکتا ہے دراصل ہمارے ارباب اختیار کا یہ فرض تھا کہ وہ گذشتہ چھ سال میں ایسے فکری اور تعلیمی اقدامات کرتے۔ جس سے اسلام کی حقانیت ابھر جاتی کیا انہوں نے ملت کے نقطہ نظر کو سنوارنے کے لئے کچھ کیا؟

ایک طرف (کٹھ) ملا نے محض ظواہر پر زور دے کر اسلام کو ختم کیا تو دوسری طرف ہمارے جدت پسندوں نے ملا کی خدمت کر کے اسلام کو نظروں سے

اد جھل کر دیا ہے۔ اس سے لامحالہ فکری افلاس اور ذہنی انتشار پیدا ہوئے اور انہوں نے اسلام کو بدنام کر دیا۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی دردناک ناکامی ہو سکتی ہے؟" (بحوالہ صدر)

عملی امداد

خلیفہ صاحب یہ بھی غلط فرماتے ہیں کہ سب اکابر علمار تعمیر پاکستان کے مخالف تھے۔ اس میں شک نہیں کہ کانگریسی علمار مخالف تھے۔ مگر مسلم لیگ کی پشت پناہی تو خود اشرف العلمار حضرت تھانویؒ کر رہے تھے جنھوں نے سب سے پہلے پاکستان کا تخیل پیش کیا تھا۔ اور جن پر قائد اعظم کو اتنا ناز تھا کہ جب ان سے کہا گیا کہ علمار تو لیگ کے ساتھ نہیں۔ تو انہوں نے جوش میں آکر فرمایا کہ:۔

"مسلم لیگ کے ساتھ ایک بہت بڑا عالم ہے۔ جس کا علم و تقدس و تقویٰ اگر ایک پلڑا میں رکھا جائے اور تمام علمار کا علم و تقدس و تقویٰ دوسرے پلڑے میں رکھا جائے۔ تو اس کا پلڑا بھاری ہوگا۔ وہ مولانا اشرف علی تھانویؒ ہیں۔ جو چھوٹے سے قصبہ میں رہتے ہیں۔ مسلم لیگ کو ان کی حمایت کافی ہے۔ اور کوئی موافقت کرے یا نہ کرے ہمیں اس کی پروا نہیں۔" (تعمیر پاکستان اور علمار ربانی)

ان کے بعد خدام دربار اشرفیہ علامہ شبیر احمد عثمانی۔ مولانا ظفر احمد عثمانی مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی اور جمعیتہ علماء اسلام مسلم لیگ کی پشت پر رہیں ان علماء کرام نے ہی تو گوشہ عزلت سے نکل کر اور ملک کے طول و عرض میں طوفانی دورے کر کے رائے عامہ کو مسلم لیگ کے حق میں بیدار کیا۔ پاکستان کے سوال پر لڑے جانے والے مرکزی اور صوبائی انتخابات محض علماء کرام کی ہی مدد سے مسلم لیگ نے جیتے۔ جن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے قائد ملت نواب زادہ لیاقت علی خاں نے مولانا ظفر احمد عثمانی کو اپنے مکتوب مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۴۵ء میں لکھا کہ:-

"آپ حضرات کا اس نازک موقع پر گوشہ عزلت سے نکل کر میدان عمل میں اس سرگرمی کے ساتھ جدوجہد کرنا بے حد مؤثر ثابت ہوا اس کامیابی پر میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔"

(تعمیر پاکستان اور علماء ربانی)

ان شواہد کی موجودگی میں یہ کہنا کہ اہل دین نے بڑھ کر سب سے پہلے پاکستان کا خیر مقدم نہیں کیا۔ یا سب علماء نے اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا آفتاب پر تھوکنا نہیں۔ تو اور کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ پھر اپنا ورق الٹنا چاہتی ہے۔ کیونکہ قوم کے اکابر میں محسن ناشناسی کا جذبہ پیدا ہونا اس کی

تنزلی کی نشانی ہے

مسٹر کا چوتھا حملہ

قائداعظم اور علامہ اقبال کے مذہبی پیشواؤں کو "جانور" اور "کولہو کا بیل" قرار دینے کے بعد خلیفہ صاحب لکھتے ہیں کہ:-

"دنیا میں دوسرے مذاہب نے بڑی بڑی تنظیمات تبلیغ کے لئے قائم کر رکھی ہیں۔ جہاں لاکھوں انسان جان و مال کی قربانی سے بودے مذہب کو بھی مضبوط کر دیتے ہیں۔ مُلّا کو تبلیغ کی توفیق نہیں ہوئی ایسے مومنوں کو کافر بنانے سے فرصت نہیں۔ فلاں کے پیچھے نماز پڑھو تو کافر۔ یا بیوی کو طلاق۔ فلاں فرقہ واجب القتل۔ فلاں فرقہ واجب التعزیر"۔ (اقبال اور ملا ص۱۵)

بے بصری

ہند و پاکستان کے اندر ایسے عظیم الشان دینی تبلیغی ادارے موجود ہیں۔ جن کی مثال سارے ایشیا میں نظر نہیں آتی مگر حیرت تو اس پر ہے کہ یہ ادارے خلیفہ صاحب کو نظر نہیں آتے حالانکہ انہی اداروں نے مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ ایسے یگانۂ روزگار عالم بے بدل پیدا کئے۔ جن سے

قائد اعظم اور علامہ اقبال نے اسلامی شعور اور دینی بصیرت حاصل کی جن کے خدام آج بھی جمہوریہ اسلامیہ پاکستان میں نہایت خاموشی سے دینی اور تبلیغی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اور جن سے ہزاروں بندگان خدا فیض یاب ہوئے ہیں۔ اگر خلیفہ صاحب کے قول کے مطابق فی الواقعہ یہاں تبلیغی تنظیمات موجود نہیں تو خلیفہ صاحب اور ان کے خواجہ تاشوں کو اینٹی ملا فرنٹ قائم کرنے اور اسے منبٹو کرنے کے لئے "اقبال اور ملا" ایسے مجموعہ ھفوات شائع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ کوششیں تو اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہاں علمار حق کی تبلیغی اور دینی سرگرمیاں اس حد تک بڑھ گئی ہیں کہ مغرب زدہ طبقے کو اپنا مستقبل خطرہ میں نظر آ رہا ہے۔ اس لئے وہ دیانت و صداقت کے تمام اصول بالائے طاق رکھ کر اچھے اور بُرے کی تمیز کئے بغیر علمار دشمنی پر اُتر آیا ہے اور طعنے علمار کو دیتا ہے کہ "اُن میں نہ فکر کی بلندی ہے اور نہ حوصلہ مندی ہے نہ دل گرم ہے، نہ نگاہ پاک ہے" کاش کہ فاضل مسٹر ذرا اپنے گریبان میں بھی جھانک لیتے۔ کہ ان "خوبیوں" کے مالک مُلا ہیں یا مسٹر۔

حقیقت اختلاف

باقی رہا علمار کے باہمی اختلاف کا مسئلہ جس پر خلیفہ صاحب بہت زور دیتے ہیں۔ ان

سے اس اعتراض کا جواب اور اس اختلاف کی حقیقت خود علامہ اقبال ایسے لوگوں کی رہنمائی کے لئے یہ لکھ گئے ہیں کہ :۔

"یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی فرقے اور دینیات کے فروعی مسائل میں اختلاف کی وجہ سے اکثر و بیشتر ایک دوسرے میں الحاد کا الزام لگاتے رہے ہیں۔ دینیات کے فروعی مسائل کے اختلاف میں، نیز الحاد کی ایسی انتہائی صورتوں میں جہاں ملحد کو جماعت سے خارج کیا جاتا ہے لفظ کفر کے غیر محتاط استعمال کو آج کل کے تعلیم یافتہ مسلمان جو مسلمانوں کے دینی مناقشات کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ ملت اسلامیہ کے اجتماعی و سیاسی انتشار کی علامت تصور کرتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے اسلامی دینیات کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فروعی مسائل کے اختلاف میں ایک دوسرے پر الحاد کا الزام لگانا باعث انتشار ہونے کی بجائے دینیاتی تفکر کو متحد کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔ پروفیسر ہرگرانج کہتے ہیں کہ "جب ہم فقہ اسلامی کی نشوونما کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک طرف تو ہر زمانے کے علماء خفیف سے اشتعال کے باعث ایک دوسرے کی مذمت یہاں تک کرتے ہیں کہ

ایک دوسرے پر کفر کا الزام عاید ہوجاتا ہے اور دوسری طرف یہی لوگ زیادہ سے زیادہ اتحاد عمل کے ساتھ پیش رودں کے اختلافات رفع کرتے ہیں"۔ اسلامی دینیات کا متعلم جانتا ہے کہ مسلم فقہا اس قسم کے الحاد کی اصطلاحی زبان میں کفر زیر کفر سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی ایسا کفر جس میں مرتکب جماعت سے خارج نہیں ہوتا"۔

(حرف اقبال صفحہ ۱۴۰ - ۱۴۸)

حقیقت اعتراض

خلیفہ اقبال کے اعتراض اور علامہ اقبال کے جواب کو پڑھنے کے بعد یہ حقیقت خود بخود ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ کہ یا تو خلیفہ صاحب سرے سے اسلامی دینیات کی تاریخ سے نابلد ہیں۔ اور ان کا تعلق اسی گروہ سے ہے۔ جس کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا ہے۔ کہ :-

"اسلامی ممالک میں عوام اور تعلیم یافتہ لوگ، دونو طبقے علوم اسلامیہ سے بے خبر ہیں"۔ (اقبال نامہ صفحہ ۴۵)

یا انہوں نے مطلب براری کے لئے عمداً اور دانستہ اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے اقبال کے اس ارشاد کی تصدیق

ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے۔"

(اقبال نامہ صفحہ ۱۶۹)

مسٹر کا اندیشہ خلیفہ صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:۔

"پاکستان ایک نصب العین اسلامی مملکت بننے کا آرزومند ہے لیکن ملائی طبقہ اس فکر میں ہے کہ تفسیر و فقہ و حدیث کی چند کتابیں طوطے کی طرح رٹ کر اس کو اس بات کا حق حاصل ہو جائے کہ ہر مسئلے میں خواہ وہ سیاسی ہو یا معاشی اس کی رائے قطعی شمار ہو۔"

معاشرتی نظام گویا خلیفہ صاحب کے خیال میں سیاسی و معاشی مسائل کو دین و مذہب سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ مگر علامہ اقبال قطعاً ایسا نہیں سمجھتے۔ وہ صاف فرماتے ہیں کہ:۔

"اسلام کے مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے۔ الگ نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا۔ تو بالآخر دوسرے کا ترک کرنا بھی لازم آئے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحہ کے لئے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہوگا۔

جو کسی ایسے وطنی یا قومی اصول پر مبنی ہو۔ جو اسلام کے اصول اتحاد کے منافی ہو۔ (حرف اقبال صہ ۲۵)

فرائض علماء

باقی رہا ملائی طبقہ کی فکر کا سوال! کہ وہ ہر معاملہ میں دخل اندازی کا حق حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک بہتان عظیم ہے۔ علماء حق کو نہ ایسے حق کی ضرورت ہے۔ نہ وہ آپ سے طلب کرتے ہیں۔ ان کا کام تو صرف گمراہوں کو راہِ ہدایت دکھانا اور بھٹکے ہوؤں کو صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرنا ہے اور بس!! ان کو یہ حق علامہ اقبال اور قائد اعظم دلانا چاہتے تھے۔ جو اپنے ذاتی تجربہ مشاہدہ اور بصیرت کی بناء پر محسوس کرتے تھے کہ مذہبی اور دینی امور پر ان علوم کے ماہرین کی رائے ہی مستند ہو سکتی ہے۔ نہ کہ ان لوگوں کی جو علوم دین کی ابجد سے [illegible] ہوں۔

مقام علماء

ملک کی سب سے بڑی عدالت یعنی فیڈرل کورٹ کے نئے چیف جسٹس آنریبل محمد منیر صاحب پنجاب کے فسادات کے سلسلہ میں اپنی تحقیقاتی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"علماء کا طبقہ فاضل اشخاص کا طبقہ ہے۔ اور تمام دوسرے خدام علم کی طرح بے حد احترام کا مستحق ہے۔ لیکن تمام فاضل اشخاص کی طرح جن

کی دماغی توتیں کسی فن میں تخصیص (خصوصیت) حاصل کرنے کے درپے رہتی ہیں۔ ہمارے علماء کا ذہن بھی یک گیر ہو گیا ہے ...... سپیشلسٹ کا دائرۂ نگاہ اپنے خاص مضمون کے سوا دوسرے مضامین کے متعلق لازماً تنگ ہوتا ہے۔ ہم "ملائیت" یا "مذہبی دیوانگی" جیسی پست اصطلاحات کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ ایک عام گریجویٹ جو اپنے مضامین میں سے کسی ایک کے متعلق نہایت سطحی علم رکھتا ہے۔ اس قسم کی اصطلاحات کو نہایت نخوت سے استعمال کرتا ہے۔ گویا وہ کوئی بڑی اعلیٰ ہستی ہے کیا آپ کسی ماہر حیوانیات پر ماہرِ حیوانیات ہونے یا کسی ماہرِ امراض پر ماہرِ امراض ہونے کا الزام عاید کر سکتے ہیں؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ علماء کا دائرۂ نگاہ اس لئے تنگ ہے کہ وہ علماء ہیں۔ بلکہ اس دائرہ کی تنگی کی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کی صرف ایک شاخ (دین) کے ماہر خصوصی ہیں۔" (صد ۳۲۳)

جیسے ماہر حیوانیات ماہر لسانیات نہیں ہوتا۔ ماہر قانون ماہر طب نہیں ہوتا۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک کو صرف اپنے علم و فن میں خصوصیت حاصل ہوتی ہے مگر وہ دوسرے علوم و فنون کے متعلق بحیثیت ایک عامی کے کچھ نہ کچھ معلومات

ضرور رکھتے ہیں۔ اسی طرح علماء کرام علوم دین میں ماہرانہ حیثیت رکھتے ہیں جو کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوتی۔ اور علوم دنیوی سے وہ بقدر ضرورت واقف ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کا عالم فاضل ہونا جسے آج کل ایک جرم تصور کیا جاتا ہے کوئی جرم نہیں ہوتا۔ ایسے مجرم ماہرین علوم کے ہر طبقہ میں پائے جاتے ہیں اور انہی کی رائے ہمیشہ صحیح اور مستند سمجھی جاتی ہے۔

مشورۂ اقبال

اسی لئے علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو مسلمانوں کو کہا تھا کہ:-

"میں علماء کی جمعیت کے قیام کا مشورہ دوں گا۔ جس میں وہ مسلمان وکلاء بھی شامل ہوں۔ جو موجودہ فقہ سے واقف ہیں۔ اس کا مقصد اسلام کی حفاظت۔ وسعت اور تجدید ہو۔ لیکن اس طور پر کہ بنیادی اصولوں کی روح قائم رہے۔ اس جماعت کو دستوری سند حاصل ہو تاکہ کوئی قانون جو مسلمانوں کے پرسنل لاء پر اثر انداز ہوتا ہو۔ اس جماعت کی منظوری کے بغیر قانون نہ بن سکے۔ اس تجویز کے محض عملی فائدہ کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئیے۔ کہ زمانہ حاضرہ اور

اس میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل ہیں) کو ابھی اسلام کے قانونی ادب
کی بیش بہا قیمت کا اندازہ نہیں۔ خصوصاً سرمایہ داری ذہنیت کی
دنیا کے لئے جہاں اخلاقی اقدار اقتصادی مسائل سے الگ کی جا
چکی ہیں۔ اس قسم کی اسمبلی کا قیام اس ملک میں اسلامی اصولوں کے
سمجھنے میں بہت مدد دے گا" (حرف اقبال ص ۹۳)

تائیدِ قائداعظم

علامہ اقبال نے جو کچھ مارچ ۱۹۳۲ء میں فرمایا تھا۔ وہی
قائدِ اعظم نے مارچ ۱۹۴۸ء میں دہرایا۔ مارچ ۱۹۴۸ء
میں قائداعظم گورنر جنرل کی حیثیت سے ڈھاکہ تشریف لے گئے۔ تو ان سے
مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے ملاقات فرمائی۔ جس کی تفصیل "تعمیر پاکستان
اور علماء ربانی" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس ملاقات کے دوران میں قائدِ اعظم
نے دستور پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

"میرا خیال ہے کہ پاکستان میں ایک شیخ الاسلام ہوگا۔ جو حکومت
پاکستان کو کنٹرول کرتا رہے گا۔ تاکہ کوئی دستور اور قانون خلاف
اسلام پاس نہ ہو سکے۔"

علامہ اقبال اور قائداعظم علماء کرام کو یہ حق اس لئے دلانا چاہتے تھے کہ

بقول علامہ اقبالؒ اسلام کے پیش نظر ایک ایسا عالمگیر نظام سیاست ہے۔ جس کی اساس وحی و تنزیل پر ہے۔" (حرف اقبال ص۲)

جس کی تفسیر و تعبیر کے لئے حق تعالے نے اشرف الانبیاء کو مبعوث فرمایا اور ان کے بعد یہ فریضہ ورثۃ الانبیا یعنی علمار کرام کے سپرد ہوا۔ مگر خلیفہ صاحب پر ان کا یہ حق بھی گراں گزر رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :-

"دین کی اصلیت از روئے قرآن ایک سادہ حقیقت ہے۔ الدین یسر۔ خدائے رحیم و کریم کی ہستی کا عقیدہ اور سیرت انسانی پر علم و عدل رحمت کی صورت میں اس کا پرتو۔ اس کے لئے نہ صرف و نحو اور ان بارہ علوم کو جاننے کی ضرورت ہے۔ جن کے بغیر ملا کہتا ہے کہ دین سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اور نہ اس کے لئے تفسیر کبیر پر حاوی ہونے کی ضرورت ہے۔" (اقبال اور ملا ص۱۱)

خلیفہ صاحب کا یہ اعتراض دراصل ملا پر نہیں۔ خدا پر ہے۔ جس نے آسان اور عام فہم قرآن کو سمجھانے کے لئے قرآن کے ساتھ معلم القرآن بھیجا۔ مگر اور جس سے علمار کرام کے حق تفسیر کی بنیاد پڑی۔ چونکہ خالق اپنی مخلوق کی کج فہمیوں اور کج ادائیوں سے بخوبی واقف تھا۔ کہ اس قوم میں برق اور پیدا ہونے

ایسے ہزاروں لوگ اٹھیں گے۔ جو خود بدلنے کی بجائے قرآن کے معنی و مفہوم کو بدل دیں گے۔ اس لئے اس نے قرآن کے ساتھ اس قوم میں معلم القرآن بھیجنا ضروری سمجھا جس میں قرآن اترا تھا۔ اور جو قرآن کی زبان بخوبی جانتی اور سمجھتی تھی۔

استغنائے علما

خلیفہ صاحب کا یہ فرمانا کہ ملائی طبقہ ہر معاملہ میں دخل اندازی کا حق حاصل کرنے کی فکر میں ہے۔ اس لئے بھی غلط ہے کہ جماعت اسلامی کو چھوڑ کر جو علماء کی جماعت نہیں۔ علماء حق کی کسی جمعیت نے بھی آج تک ایسا مطالبہ نہیں کیا۔ نہ انہیں اس کی ضرورت ہے۔ اگر وہ ہر معاملہ میں تحکم کرنا چاہتے اور مداخلت کا حق محفوظ رکھنا چاہتے تو رئیس العلماء مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کی زمام اقتدار سنبھالنے والے قائد اعظم اور ان کے رفقاء کار کو دیندار اور دیانتدار بنانے کے لئے تبلیغ کرنے کا اہتمام کیوں کرتے؟ وہ خود ہی جماعت اسلامی کی قسم کی کوئی جماعت تیار کرکے حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے۔ بلکہ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ملتان میں مدرسہ عربی خیر المدارس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ۱۹۴۹ء میں ارباب اختیار کو صاف فرما دیا تھا

کہ:-

"آپ بے فکر ہو کر کام کریں - ہم آپ کی کرسیاں نہیں چھیننا چاہتے۔ ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ جس طرح پہلے آپ نے انگریزی نظامِ حکومت میں تمام انگریزی قانون و قاعدے سیکھے ہوئے تھے۔ اسی طرح پاکستان کی اسلامی حکومت کو چلانے کے لئے البتہ ضرورت اسلامی قانون بھی سیکھ لیں۔ تاکہ آپ خود باطمینان یہ کام چلا سکیں۔"

اس سے بڑھ کر فکر کی بلندی۔ حوصلہ مندی اور وسعتِ قلبی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اقتدار کی جس مسند کے چھینے جانے کا مسٹر کو خوف و خطرہ تھا۔ علماء کرام اسی مسند کا خود اسے محافظ بنانا چاہتے ہیں۔

اقبال کی پیشگوئی

مگر افسوس کہ مسٹر نے خود کو اس بات کا اہل ثابت نہیں کیا۔ جس کا علامہ اقبال کو خطرہ تھا۔ اور جس کا اظہار انہوں نے اسی دن کر دیا تھا جس دن اسلامی سلطنت کا مطالبہ کیا تھا کہ:-

"جو طرزِ عمل ہم نے مذہب میں اختیار کر رکھا ہے۔ اب وہی سیاسیات میں ہو گیا ہے۔ لیکن مذہبی فرقہ بندیوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا

کیونکہ ان سے کم از کم اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں اصول سے دلچسپی ہے۔ جس پر ہماری ترکیب کا انحصار ہے۔ مزید براں یہ اصول اس قدر وسیع ہے کہ کسی فرقہ کو اس قدر جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ اسلام کی حدود سے ہی باہر نکل جائے۔ برعکس اس کے اگر سیاسی زندگی میں اختلافات کو جائز رکھا گیا۔ بالخصوص اس وقت جب مفاد ملت کی خاطر اتحاد عمل کی ضرورت ہے۔ تو اس کا نتیجہ سوائے ہلاکت کے اور کچھ نہیں ہوگا۔" (حرف اقبال ص۵۵)

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پاکستان بننے کے بعد جب اس کے آئین کی تیاری کا مرحلہ آیا تو ان مسٹروں نے آٹھ سال کا طویل اور صبر آزما عرصہ دستور بنانے کی بجائے سیاسی تفرقہ پردازی اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں لگا دیا۔ اور ان کے مقابلہ میں مختلف فرقوں کے ۳۱ نمائندہ علما کرام نے صرف چار دن کے اندر متفقہ طور پر دستوری خاکہ تیار کر کے نہ صرف ارباب اقتدار کو بلکہ ساری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اور اتحاد عمل کا تاریخی ریکارڈ قائم کر کے مسٹر کو جتلا دیا کہ اگر انسان کی کام کرنے کی نیت ہو۔ تو سب کچھ ہو سکتا ہے اور ع

نہ چاہو۔ تو کوئی طریقہ نہیں ہے

چنانچہ خلیفہ صاحب کو بھی علمار کرام کے اس تاریخی کارنامہ کا بادلِ ناخواستہ اعتراف کرنا پڑا کہ :-

"ان لوگوں نے ایک محاذ بنانے کی تھوڑی سی کامیاب کوشش کی لیکن یہ وحدت مقصد محض تعلیمات اور بنیادی اصولوں تک ہے"۔ (اقبال اور مُلا ص ۲۶)

آگے اگر علمار کرام کو کام نہ کرنے دیا جائے۔ تو یہ ان کا قصور نہیں۔ مسٹر سے تو آٹھ سال میں اتنا بھی نہ ہو سکا۔ جو "مُلا" نے چار دن میں کر دکھایا۔

خیانت مسٹر

۲۲ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو دستور ساز اسمبلی میں بنیادی اصولوں کی جو رپورٹ پیش ہوئی۔ اس میں ایک اہم ترین دفعہ یہ تھی کہ ملک کا کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔ اور اس امر کی تصدیق کے لئے کہ آیا کوئی قانون کتاب وسنت کے موافق ہے یا نہیں؟ پانچ علمار کا ایک بورڈ بنانے کی تجویز حکومت طرف سے پیش کی گئی مگر خلیفہ صاحب نے حکومت کی اس تجویز کو علمار کرام کے سر تھوپ دیا۔ کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ :-

"پانچ ملاؤں کو جو بقول اقبال لغت ہائے حجازی کے قارون ہوں

ہر مسئلہ میں ردو قبول کی اجازت دی جائے اور ان مدعیان دین کی
رخصت کے بغیر نہ دستور بن سکے اور نہ قانون۔"

(اقبال اور ملا صـ۱۷)

دیانت علماء

حالانکہ علماء کرام نے قطعاً ایسا مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ
یہ تجویز حکومت کی طرف سے تھی۔ جو نہ صرف بدلے
ہوئے حالات کے ماتحت ضروری تھی۔ بلکہ علامہ اقبال کے اس مشورہ کے
بھی عین مطابق تھی۔ جو انہوں نے ۲۱ مارچ ۳۲ء کو لاہور میں مسلمانوں کو
دیا تھا۔ اور جس کا ذکر ابھی پچھلے صفحات میں گذر چکا ہے۔

چونکہ اس سلسلہ میں شاہان عثمانیہ کے زمانہ میں امت مسلمہ کو کچھ تلخ
تجربات ہوئے تھے۔ اس لئے ہر طبقہ کے نمائندہ علماء کے اس اجتماع نے،
جو دستوری سفارشات پر غور و خوض کرنے کے لئے ماہ جنوری ۱۹۵۳ء میں
کراچی میں ہوا۔ اپنے ذاتی مفاد اور وقار کو قومی مفاد اور وقار پر قربان کرتے
ہوئے پوری دیانتداری کے ساتھ حکومت کی اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ اور اس
امر کے فیصلہ کرنے کا حق بھی مقننہ کو ہی تفویض کرنے کا، حکومت کو مشورہ دیا۔
اور اپنے متفقہ فیصلہ میں لکھا کہ:-

پیراگراف ۴ - ۵ - ۶ اور ۸ میں قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی کی روک تھام کے لئے علماء کے بورڈ کے قیام کی جو صورت پیش کی گئی ہے۔ وہ نہ کسی لحاظ سے معقول ہے۔ اور نہ اس طرح کی قانون سازی کو روکنے کے لئے موثر ہی ہو سکتی ہے۔ البتہ اس سے بہت سی نئی خرابیاں پیدا ہو جانے کا قوی امکان ہے۔ ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ جس طرح دوسرے قوانین کے معاملہ میں حدود دستور سے متجاوز قانون سازی کی روک تھام کے لئے تعبیر دستور کے اختیارات سپریم کورٹ کے سپرد کئے گئے ہیں۔ اسی طرح پیراگراف ۳ کے معاملہ کو بھی سپریم کورٹ ہی پر کیوں نہ چھوڑا جائے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ جس وقت تک ہمارے ملک میں نئے دستور کے تقاضوں کے مطابق کتاب و سنت میں بصیرت رکھنے والے قابل جج پیدا نہ ہوں۔ اس وقت تک کے لئے کوئی ایسا عارضی انتظام تجویز کر دیا جائے جس سے سپریم کورٹ میں پیراگراف ۳ کے منشار کے مطابق کتاب و سنت کی صحیح تعبیر کی جا سکے۔

(متفقہ تبصرہ و ترمیمات ص۴ و ص۵)

ایسے تاریخی فیصلہ کی روشنی میں حکومت کی ایک تجویز کو علماء کرام کی خواہش قرار دے کر عوام میں ان کے خلاف نفرت پھیلانے کی سعی کرنا کہاں کی دیانتداری ہے ؟ مگر خلیفہ صاحب کو چونکہ علماء کرام کے خلاف زہر پھیلانا مقصود تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنی ذمہ داری کا احساس نہ کرتے ہوئے تلبیس سے کام لیا۔

مسٹر کی نااہلیت

ایک طرف تو خلیفہ صاحب دنیا کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ علماء کے طبقہ کے :-

"ہاتھ میں عنانِ اقتدار دینا۔ پاکستان کو ضلالت کے گڑھے میں دھکیلنا ہے۔" (اقبال اور ملا ص۲۵)

اور دوسری طرف خلیفہ صاحب کے بھائی بندوں کی یہ حالت ہے کہ وہ آئین سازی میں ہر ممکن روڑے اٹکا کر پاکستان کی ترقی کے وسائل مسدود اور اپنے اقتدار کی گدیاں کو قائم رکھنے کے ذرائع کو مضبوط کرتے رہے جس کی وجہ سے جناب غلام محمد صاحب گورنر جنرل پاکستان کو اکتوبر ۵۴ء میں جراتِ رندانہ سے کام لیتے ہوئے دستور ساز اسمبلی کو معطل کرنا پڑا اور اس طرح مسٹر کی نا اہلیت نے دولتِ مشترکہ کی تاریخ میں ایک ایسی مثال قائم کر دی جو ہمیشہ اس کے ماتھے پر کلنک کے ٹیکہ کا کام دے گی۔ مگر اس نے

پہلی دستور یہ کے توڑے جانے کے بعد بھی کوئی سبق حاصل نہ کیا۔ اور جس وقت دوسری دستور ساز اسمبلی میں ایک یونٹ بل پیش ہوا جس کی منظوری کے بعد دستور پیش ہونا تھا۔ تو اس نے معاملہ کو مزید تاخیر و تعویق میں ڈالنے کے لئے صرف اس امر پر بحث کرنے میں کہ یہ بل سلیکٹ کمیٹی کے سپرد کیا جائے یا نہ؟ پورے ۲۵ دن لگا دیتے۔ جس سے تنگ آکر چوہدری محمد علی صاحب وزیر اعظم پاکستان کو ارکان دستور سے کھلے اجلاس میں کہنا پڑا کہ:۔

"دستور ساز اسمبلی ایک یونٹ کو منظور کرنے میں جس رفتار سے کام کر رہی ہے۔ عوام اس سے مطمئن نہیں ہیں اور ملک میں دستوریہ کے کام کی رفتار پر گہری تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ایک یونٹ بل پر بحث خواہ مخواہ طویل ہوتی جا رہی ہے۔ اور بہت سی ایسی باتیں کہی جا رہی ہیں۔ جو غیر ضروری اور غیر متعلقہ ہیں۔"

(نوائے وقت ، ۱۰ ستمبر ۱۹۵۵ء)

دستور بنانا تو ایک طرف رہا۔ مسٹر زمام اقتدار سنبھالنے میں بھی اتنا ناکام ہوا کہ نواب افتخار حسین خاں صاحب ممدوٹ گورنر سندھ کو بر ملا کہنا پڑا کہ

"حکومت سیاستدانوں کے ہاتھوں سے نکل کر سروسز (SERVICES) کے ہاتھ میں جا رہی ہے"

کیا یہ حقائق اس بات کے شاہد نہیں کہ اتحادِ عمل کا فقدان مسٹروں میں ہے ملاؤں میں نہیں۔ اور کہ قوم کی ہلاکت کا سبب مسٹر ہے ملا نہیں۔ ان حالات میں خلیفہ صاحب کس برتے پر علماء کو کوستے ہیں کہ:۔

"ایسے لوگوں سے رہنمائی اور خیر کی کیا توقع ہو سکتی ہے؟ ان کے انداز دیکھ کر کسی کو خیر کی توقع نہیں ہو سکتی ..... ان لوگوں کے نہ ضمیر روشن ہیں اور نہ دماغ منور۔" (اقبال اور ملا صفحہ ۲۶،۲۷)

اب آپ ہی انصاف فرمائیں کہ بحالات بالا یہ الزام علماء پر ہوتا ہے یا خود مسٹر کی ذات گرامی پر؟

خطرہ کا احساس

ممالک اسلامیہ کے عوام اور تعلیم یافتہ افراد کو علوم اسلامیہ سے بے بہرہ دیکھ کر علامہ اقبال نے ۱۹۲۶ء میں ہی یہ خطرہ محسوس کیا تھا کہ:۔

"میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میرے دل میں ممالک اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ ذاتی

لحاظ سے خدا کے فضل وکرم سے میرا دل پورا مطمئن ہے یہ بے چینی
اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل
گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کرلے۔"   (اقبال نامہ ص۱۵۵)
اس بابصیرت انسان کو یہ خطرہ اس لئے محسوس ہو رہا تھا:۔
ا۔ ملت اسلامیہ میں ایسے رہنماؤں کا فقدان تھا کہ جن کو "امارت
ایزدی یا اپنے وسیع تجربات کی بدولت ایک طرف یہ ادراک حاصل
ہو کہ اسلامی تعلیمات کی روح اور اس کی تقدیر کیا ہے۔ دوسری
طرف ان میں یہ صلاحیت موجود ہو۔ کہ وہ جدید حوادث کی رفتار
کا اندازہ صحت کے ساتھ کرسکیں۔
ب۔ دوسرا مرض جو مسلمانوں کے اندر گھر کر چکا ہے۔ یہ ہے کہ ان
میں اطاعت کا مادہ باقی نہیں رہا۔"   (حرف اقبال ص۵۵)
ج۔ بخلاف اس کے قریباً ہر خطہ کا مسلمان مغربی تعلیم و تہذیب
کا دلدادہ ہو رہا ہے۔

اجتہاد کی راہ

چنانچہ ان حالات نے اقبال کے اندیشہ کو صحیح ثابت کر دیا
اور مغرب زدہ مسلمانوں نے گھبرا کر اجتہاد کی راہ اختیار کی

ایسے اجتہاد کی جس نے اسلام کی روح کو ہی کچل کر رکھ دیا۔ کیونکہ دینِ اسلام سے گلوخلاصی کے لئے اس کے سوا ان کے لئے اور کوئی راستہ ہی نہ تھا۔ ایک طرف تو عصر جدید کے ان "مجتہدوں" اور "مفکروں" نے البانیہ میں وضو اڑانے کی ٹرکی میں اذان کے الفاظ بدلنے کی۔ مصر میں روزہ کو غیر ضروری ثابت کرنے کی کوشش کی دوسری طرف پاکستان میں نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔ قربانی ایسے شعائر اسلام کو ختم کرنے کی تحریک "طلوع اسلام" کے نام سے جاری کی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اطاعتِ رسول ؐ سے انحراف اور تقلیدِ سلف سے گریز کی تعلیم دی جانے لگی۔ کفر و الحاد اور دجل و فریب کے اس لٹریچر کو موجودہ تعلیم یافتہ طبقہ اسی طرح ہاتھوں ہاتھ لینے لگا جس طرح فحش لٹریچر! اور دوسری طرف کفر و الحاد کی ان تحاریک کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کے متعلق یہ مشہور کیا جانے لگا کہ :۔

"تعلیم کے لحاظ سے مُلا چودھویں صدی ہجری میں نہیں بلکہ چوتھی صدی میں رہتا ہے اور اس نے یہ عقیدہ استوار کر رکھا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ چوتھی صدی کے بعد بند ہو چکا ہے۔ جو لکیریں پہلے پڑ چکی ہیں۔ ان سے سرمو تجاوز نہیں ہو سکتا۔ آگے بڑھنے

کی بجائے جو راستے طے ہو چکے ہیں۔ یہ بار بار انہی کی طرف لوٹتا ہے۔ اور کولہو کے بیل کی طرح اس کی گردش کوئی فاصلہ طے نہیں کرتی۔ اور وہ ایک قدم کسی سمت آگے نہیں بڑھاتا"؟

(اقبال اور ملاحت)

کیونکہ مغرب زدہ طبقہ بخوبی جانتا ہے۔ علماء کرام کی جماعت ان کی خواہشات کے مطابق کتاب و سنت میں بنیادی تبدیلی کبھی قیمت پر نہیں کر سکتی۔ اس لئے انہوں نے ان کی زبان بندی کے لئے یہ الزام لگانا شروع کر دیا ہے کہ ان لوگوں نے اجتہاد کا دروازہ بند کر رکھا ہے۔ حالانکہ یہ دروازہ بند نہیں کیا گیا۔ بلکہ بدستور کھلا ہے اور اس سے ابھی شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ گذر چکے ہیں۔ اگر فرنگی ساخت کے مجتہد اور مفکر اس دروازہ کو بند پاتے ہیں تو ان کے لئے یہ دروازہ خود علامہ اقبال نے بند کر رکھا ہے کیونکہ اجتہاد ایک بہت ہی نازک مسئلہ ہے۔ اور بقول عالیمرتبت جناب ایس اے رحمٰن صاحب چیف جسٹس ہائیکورٹ مغربی پاکستان:۔

"اس میں بہت حزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔ تاکہ اسلامی روح فنا نہ ہو جائے"۔

علامہ اقبال کو تدوین فقہ کی ازحد فکر تھی۔ اور فرماتے تھے کہ:-

"آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے۔ جس میں زندگی کے اُن سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو۔ جن کو دنیا کی موجودہ قومی اور بین الاقوامی۔ سیاسی معاشی اور سماجی احوال وظروف نے پیدا کر دیا ہے"۔

(حیات انور صفحہ ۱۹۵)

مگر مشکل یہ تھی کہ علامہ اقبال کو مسٹر غلام احمد پرویز (جنھیں علوم اسلامیہ سے ناواقف طبقہ مفکر اسلام کہتا اور لکھتا ہے) کی موجودگی کے باوجود کوئی ایسا با بصیرت انسان نظر ہی نہ آتا تھا۔ جو اس دروازہ سے گذرنے کی صلاحیت وقابلیت رکھتا ہو۔ یہاں تک کہ خود علامہ اقبال نے بھی اس دروازہ سے اکیلے گذرنے کی کوشش کی۔ مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جیسا کہ خود ان کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ:-

"میں نے ایک رسالہ اجتہاد پر لکھا تھا۔ مگر چونکہ میرا دل بعض امور کے متعلق خود مطمئن نہیں۔ اس واسطے اس کو اب تک شائع نہیں کیا"۔

(اقبال نامہ صفحہ ۱۴۳)

تاریخ و تدوینِ فقہ کے عظیم الشان کام تک پہنچے۔ مگر اس اہم علامہ اقبال کی نظریں بار بار اُٹھتی تھیں۔ تو اسی طبقۂ مُلا کی طرف اُٹھتی تھیں جس کو بقول خلیفہ صاحب :-

"جب بھی سوجھے گی۔ کوئی ادنیٰ بات ہی سوجھے گی۔ کبھی بلند مقصد کے لئے قربانی تو درکنار وہ مقصد ہی ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا"

(اقبال اور ملا ص ۲)

فقہ اسلامی کی تاریخ لکھنے کے لئے تو وہ مورخِ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی کو موزوں ترین فرد سمجھتے تھے۔ اور اس کے لئے انھوں نے علامہ موصوف سے درخواست بھی کی تھی کہ :-

"اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہِ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے۔ اس مبحث پر مصر میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی تھی۔ جو میری نظر سے گذری مگر افسوس ہے کہ بہت مختصر ہے۔ اور جن مسائل پر بحث کی ضرورت ہے۔ مصنف نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر مولانا شبلیؒ زندہ ہوتے تو میں ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ صورت

میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا۔

آپ سے درخواست ہے کہ اس کام کو مستقل طور پر اپنے ہاتھ میں لیجئے۔ ندوہ کے دیگر ارکان، فارغ التحصیل طلبا کو بھی اپنے ساتھ ملایئے۔ تاکہ اقوام اسلامیہ کو اسلامی فقہ کی اصل حقیقت معلوم ہو۔

(اقبال نامہ ص ۱۴۳ ۔ ص ۱۴۴)

اور تدوین فقہ کے لئے ان کی نظر انتخاب کشمیری مُلّا یعنی حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر پڑی۔ جن سے انہوں نے اسلامیات میں بہت کچھ استفادہ کیا تھا۔ جن کے فیض صحبت نے ان کی روح کو جلا بخشی تھی۔ جن کی مدد سے انہوں نے انگریزی زبان کے مشہور و معروف چھ لیکچر لکھے تھے۔ جن کو انہوں نے اہل یورپ سے متعارف کرایا تھا۔ جن کے لئے انہوں نے کوٹھی اور کتب خانہ مہیا کرنے کے لئے دوستوں سے چندہ کی اپیل کی تھی۔ اور جن کے متعلق انہوں نے لاہور کے ایک جلسہ عام میں لوگوں کو مطلع کیا تھا کہ:۔

"مولانا محمد انور شاہ صاحب کی مثال پیش کرنے سے اسلام کی پانچ سو سال کی تاریخ عاجز ہے"

(دارالعلوم ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۹ھ)

[illegible] میں جب حضرت انور شاہ صاحب دارالعلوم دیوبند سے علیحدہ ہو گئے تو جناب مولانا حبیب احمد صاحب ایم اے۔ اکبر آبادی۔ پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ نے علامہ اقبال سے اس کا تذکرہ کیا۔ علامہ اقبال سے اس وقت اس پر جو گفتگو ہوئی۔ وہ درج ذیل ہے:۔

"علامہ اقبال نے فرمایا کہ آپ کا یا دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تاثر ہو۔ میں بہر حال شاہ صاحب کے استعفیٰ کی خبر پڑھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔ میں نے بڑے تعجب سے عرض کیا کہ کیا آپ کو دارالعلوم دیوبند کے نقصان کا کچھ دھیان نہیں ہے؟ فرمایا کیوں نہیں! مگر دارالعلوم کو تو صدر مدرسین اور بھی مل جائیں گے۔ اور یہ جگہ خالی نہ رہے گی۔ لیکن اسلام کے لئے اب جو کام میں شاہ صاحب سے لینا چاہتا ہوں اس کو سوائے شاہ صاحب کے دوسرا کوئی انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے بعد انہوں نے اس اجمال کی تفصیل یہ بیان کی کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے جس میں زندگی کے ان سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو جن کو دنیا کے موجودہ قومی۔ بین الاقوامی سیاسی۔ معاشی اور سماجی

احوال وظروف نے پیدا کر دیا ہے۔ مجھ کو پورا یقین ہے کہ اس کام کو
میں اور شاہ صاحب دونوں مل کر ہی کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ
اور کوئی شخص اس وقت عالم اسلام میں ایسا نظر نہیں آتا۔ جو اس
عظیم الشان ذمہ داری کا حامل ہو سکے۔"

(حیاتِ انور ۱۶۵ و ص ۱۶۶)

اس گفتگو سے صاف ظاہر ہے کہ:۔

(ا) علماء کرام نے اجتہاد کا دروازہ بند نہیں کیا ہوا۔ اور نہ وہ اسے بند سمجھتے ہیں۔ ورنہ علامہ اقبال ان کی طرف اس سلسلہ میں رجوع کیوں کرتے۔

(ب) اجتہاد ہر شخص کے بس کا کام نہیں۔ کہ جو بھی چاہے۔ مجتہد بن بیٹھے۔ اس کے لئے ایسے علم و تقوٰے۔ فہم و فراست اور قابلیت و صلاحیت کی ضرورت ہے۔ جو حضرت شاہ صاحب رکھتے تھے۔

(ج) اس مفکرِ اسلام کو دنیائے اسلام میں حضرت شاہ صاحب کے سوا کوئی دوسرا شخص اس کا اہل ہی نظر نہ آتا تھا۔ حالانکہ اس وقت مسٹر پرویز جنہیں آج مغرب زدہ طبقہ مفکرِ اسلام بنائے پھرتا ہے۔ علامہ اقبال کے قدموں میں رہتے تھے یعنی ان کے علامہ اقبال سے خصوصی مراسم تھے۔ اگر

ان میں رائی بھر بھی اس کام کی اہلیت وصلاحیت ہوتی۔ یا پیدا ہونے کا امکان ہوتا تو لازماً علامہ اقبال ان کا نام بھی لیتے۔ کیونکہ ان کی بصیرت و فراست تو اتنی بڑھی ہوئی تھی۔ کہ وہ ۱۹۳۰ء میں کھڑے ہو کر بیس سال بعد پیش آنے والے واقعات سے قوم کو آگاہ کر رہے تھے۔

اعلانِ جنگ خلیفہ صاحب علامہ اقبال کے مذہبی پیشواؤں کے خلاف نفرت کا اظہار کرنے کے بعد علماء کرام کے خلاف مسلمانوں کو یوں اکساتے ہیں کہ :-

"میں سمجھتا ہوں کہ خدا کا اقبال پر یہ بڑا فضل تھا۔ کہ وہ پاکستان کے قیام سے پہلے ہی عالم بقا کو سدھارے۔ اگر وہ زندہ رہتے۔ تو دستور مملکت اور تشکیل فقہ جدید میں ان کو قائدانہ حصہ لینا پڑتا۔ اس وقت وہ دیکھتے کہ ملائیت ان کو ایک قدم نہ اٹھانے دیتی"

(اقبال اور ملا صـ۲۱)

ذرا آگے چل کر خلیفہ صاحب پھر یہ لکھتے ہیں کہ :-

"اقبال اگر اس وقت زندہ ہوتے۔ تو ملائیت سے ان کی بڑی جنگ ہوتی"

(ایضاً صـ۲۳)

جہادِ اقبال

حالانکہ علامہ اقبال اپنی ساری زندگی میں "ملا" کے حق میں اور مسٹر کے خلاف معروفِ جہاد رہے ہے۔ حکیم احمد شجاع صاحب سابق سیکرٹری پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی ایک زمانہ میں پاکپتن جا کر مقیم ہوئے۔ اور وہاں کے دینی مدرسہ کو حکامِ وقت کی مدد سے ہائی سکول میں بدل دیا۔ جب تک یہ ارباب حل و دن اللہ وہاں رہے۔ مدرسہ خوب چلتا رہا۔ مگر جب وہ وہاں سے بدل گئے۔ مدرسہ کی مالی حالت خراب ہو گئی۔ اور وہاں کے مسلمانوں نے اس کی بجائے وہی اپنا پرانا دینی مدرسہ چلانا چاہا جس سے حکیم صاحب کو سخت صدمہ ہوا۔ اور وہ مسلمانانِ پاکپتن کی شکایت لے کر علامہ اقبال کے پاس پہنچے۔ حکیم صاحب اپنی "خوں بہا" میں لکھتے ہیں کہ:-

"کسی قطعی اقدام سے پہلے میں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اپنے فیصلے کو اس عظیم الشان انسان کی رائے سے مضبوط اور مستحکم کروں۔ جس کی فطرتِ حق شناس کی تجلی، زندگی کی کٹھن مشکل راہوں میں میری شمع ہدایت بن چکی تھی۔ اور جو اس فطری سعادت کے باعث، بعد میں حکیم الامت کے عالی قدر لقب سے مشہور ہوا۔ لاہور آکر میں نے پاکپتن شریف کے مسلمانوں کی یہ نفسیاتی

کیفیت اور اپنے ان احساسات کی روئیداد مہ نہد انہوں کو سُنائی وہ پہلے تو حسب عادت میری باتیں غور سے سُنتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ انہیں میرے احساسات سے ہمدردی ہے۔ پھر آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگے۔ جب میں اپنی کہانی سُنا چکا۔ تو فرمایا "جب میں تمہاری طرح جوان تھا۔ تو میرے قلب کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی۔ میں بھی وہی کچھ چاہتا تھا۔ جو تم چاہتے ہو۔ انقلاب! ایک ایسا انقلاب!! جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مہذب اور متمدن قوموں کے دوش بدوش کھڑا کر دے۔ یورپ کے دیکھنے کے بعد میری رائے بدل گئی ہے۔ ان (دینی) مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو۔ اگر یہ مُلّا اور یہ درویش نہ رہے۔ تو جانتے ہو۔ کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا۔ میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔۔۔ اگر ہندوستان کے مسلمان ان (دینی) مکتبوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح جس طرح ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء، اور باب الاخوتین کے سوا، اسلام کے پیرووں اور اسلامی تہذیب

کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا۔ ہندوستان میں آگرے کے تاج محل اور دلی کے لال قلعہ کے سوا، مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔" پھر اس مفکرِ اعظم کی آنکھیں جواب آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ فضاء کی وسعتوں میں کچھ دیکھنے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ جو کچھ وہ دیکھ رہی ہیں ہمیں نظر نہیں آتا۔ پھر اسی طرح فضا میں نظریں گاڑے اپنی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی لے میں، جو اُن کے آنسوؤں کے رُکے ہوئے طوفان کو اپنے اندر جذب کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ یہ اشعار پڑھنے لگے:۔

کل ایک شوریدہ بارگاہِ نبیؐ پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ مصر و ہندوستاں کے مُسلم، بنائے ملت مٹا رہے ہیں
غضب ہیں۔ یہ مرشدانِ خود بیں۔ خدا تری قوم کو بچائے
مسافرانِ رہِ حرم کو۔ رہِ کلیسا دکھا رہے ہیں"۔

(خوں بہا۔ حصہ اوّل۔ صفحہ ۱۳۲ تا صفحہ ۱۴۴)

چنانچہ حکیم صاحب وہ ہائی سکول بند کر کے اور وہاں وہی دینی مدرسہ جاری

کر کے پاکپتن سے واپس آ گئے۔

آپ حیران ہوں گے کہ علامہ اقبال کی چشم دور بین، فضا کی وسعتوں میں کن کو دیکھ رہی تھی۔ اور آنسو بہا بہا کر کن کا ماتم کر رہی تھی؟ دورِ حاضرہ کے "مرشدانِ خود بیں" نے بنائے ملت ڈھانے اور مسافرانِ حرم کو راہِ کلیسا دکھانے کی جو تحریکیں شروع کر رکھی ہیں۔ وہ بزبانِ حال پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ علامہ اقبال اُس وقت پرویز۔ برق اور خلیفہ جیسے "رہبرانِ گم کردہ راہ" کا بچشم تر ماتم کر رہے تھے۔ جو دُنیا کو "نبوی اسلام" چھوڑنے اور "مغربی اسلام" قبول کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔

اتباعِ اقبال خلیفہ صاحب کے اس بہتان کی تردید کہ اگر علامہ اقبال آج زندہ ہوتے۔ تو وہ علمار کرام کے خلاف اعلان جنگ کرتے۔ ایک دوسری دستاویز سے بھی ہوتی ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کے زریں زمانہ یعنی ۱۹۲۰ء میں انگریزوں کا بائیکاٹ کیا جا رہا تھا۔ جس کا اثر علی گڑھ اور لاہور کے اسلامیہ کالج پر بھی پڑا۔ سرکاری گرانٹ لینے اور سرکاری اداروں سے الحاق کرنے کے خلاف بڑے زور شور سے ملک کے طول و عرض میں آواز اٹھائی گئی۔ اس سلسلہ میں انجمن حمایت

اسلام کے ممتاز رکن علامہ اقبال اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲۸ر اکتوبر ۱۹۲۰ء میں
خان محمد نیاز الدین خاں مرحوم کو لکھتے ہیں کہ :-

"میری تو یہی رائے ہے کہ گرانٹ اور الحاق کے بارے میں جو
فتویٰ علماء کا ہو۔ اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ چونکہ واجب الطاعت
امام اس وقت موجود نہیں۔ اس واسطے جمہور مشاہیر علماء ہند
کا فتوٰے ضروری ہوگا۔ صرف ایک عالم کا فتوٰے اس بارے
میں کافی نہیں۔ خواہ وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ علماء کی غالب جماعت
کا اس پر اتفاق ہونا چاہیئے۔ ذاتی رائے میری خواہ کچھ ہی کیوں
نہ ہو۔ اگر علماء کا فتویٰ میری رائے کے خلاف ہو۔ تو سر تسلیم
خم ہے" مکاتیب اقبال ص ۳۵

یہ حقائق اس بات کے شاہد ہیں کہ اگر آج حکیم الامت علامہ اقبال زندہ
ہوتے۔ تو وہ علماء کرام کے خلاف نہیں۔ بلکہ علماء کرام کے جھنڈے
تلے کھڑے ہو کر حسب سابق مسٹر کے خلاف جہاد کرتے۔ جو اس وقت
اسی طرح پاکستان سے اسلام کو رخصت کرنے کے درپے ہے۔ جس
طرح ہندوستان سے ہندو اسلام کو باہر نکالنے میں مصروف ہیں۔

آج کل جو "مفکرین" امتِ مسلمہ کو دورِ جاہلیت کی طرف واپس لے جانے کی سعی میں مصروف ہیں۔ جس میں نہ اطاعتِ خدا و رسول ضروری تھی، اور نہ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ اور قربانی ایسی عبادات کی ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ اُن کے خلاف علامہ اقبال ۱۹۲۶ء سے مصروفِ جہاد تھے۔ کیونکہ یہ مفکر انہی کے سایۂ عاطفت میں پل رہے تھے۔ اور علامہ اقبال اپنی فراست کی بناء پر جانتے تھے کہ یہ ایک دن مارِ آستین ثابت ہوں گے۔ اور قوم کو بڑے نام پر دھوکا دیں گے۔ اس لئے انہوں نے علامہ سید سلیمان ندوی کو اپنے افکار و خیالات کا گواہ بنانے کے لئے لکھا کہ:۔

"عبادات کے متعلق کوئی ترمیم و تنسیخ میرے پیشِ نظر نہیں ہے۔ بلکہ میں نے اپنے مضمون اجتہاد میں ان کی ازلیت و ابدیت پر دلائل قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔" (اقبالنامہ صفحہ ۱۲۶)

چنانچہ اقبال کا خیال صحیح نکلا۔ عباداتِ اسلامی پر خطِ تنسیخ کھینچنے والے مسٹر پرویز نے اپنے اجتہاد کو مقبول بنانے کے لئے عوام کو یقین دلایا کہ:۔

"اُس کا خاکہ علامہ اقبال کے ذہن کا رہینِ منت ہے۔"

(قرآنی فیصلے صفحہ ۲۶۸)

اور اس یقین دلانے کے بعد انہوں نے علامہ اقبال کی آڑ میں امتِ مسلمہ کو قرآن سے دُور کرنے کے لئے ناصحانہ انداز میں لکھا کہ:-

"یہ عقیدہ کہ بلا سمجھے قرآن کے الفاظ دہرانے سے "ثواب" ہوتا ہے یکسر غیر قرآنی عقیدہ ہے۔" (قرآنی فیصلے صفحہ ۱۰۲)

حالانکہ علامہ اقبال امتِ مسلمہ کو قرآن کے قریب لانے کے لئے لکھتے ہیں کہ:-

"قرآن کثرت سے پڑھنا چاہئے۔ تاکہ قلب محمدی نسبت پیدا کرے اس نسبت محمدیہ کی تولید کے لئے یہ ضروری نہیں کہ قرآن کے معانی بھی آتے ہوں۔ خلوص و محبت کے ساتھ محض قرأت کافی ہے۔" (مکاتیب اقبال صفحہ ؟)

مسٹر کے مقابلہ میں کیا کبھی کسی "مُلّا" نے بھی اقبال کے نام پر قوم کو اس طرح دھوکا دیا ہے؟

احتیاطِ اقبال

علامہ اقبال چونکہ مسٹر کی فطرت سے واقف تھے اور وُہ جانتے تھے کہ مسٹر ان کے دینی عقاید سے اتفاق نہیں کرے گا۔ اس لئے اس معاملہ میں وہ زیادہ تر خاموشی سے کام

لیتے تھے۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"میرا عقیدہ ہے کہ نبی کریم زندہ ہیں۔ اور اس زمانے کے لوگ بھی ان کی صحبت سے اس طرح مستفیض ہو سکتے ہیں۔ جس طرح صحابہ ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں تو اس قسم کے عقاید کا اظہار بھی اکثر دماغوں کو ناگوار ہوگا۔ اس واسطے خاموش رہتا ہوں:

(مکاتیب اقبال ص۱۲)

وہ ایک دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ:۔
"میں لاہور کے ہجوم میں رہتا ہوں۔ مگر زندگی تنہائی کی بسر کرتا ہوں مشاغل ضروری سے فارغ ہوا۔ تو قرآن یا عالم تخیل میں قرون اولیٰ کی سیر۔ مگر خیال کیجئے۔ جس زمانے کا تخیل اس قدر حسین و جمیل و روح افزا ہے۔ وہ زمانہ خود کیسا ہوگا ؎

خوشا وہ عہد کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ روز کہ دیدار عام تھا اس کا"

(مکاتیب اقبال ص۸)

اندیشہ اقبال | علامہ اقبال کی یہ خاموشی و خانہ نشینی محض اس لئے تھی

کہ وہ جانتے تھے کہ یہ عقل پرستی کا دور ہے۔ اس دور کے مفکرین اپنی عقل و فہم کے سوا کسی اور کا اتباع نہیں کریں گے۔ اس لئے انہوں نے کھلے لفظوں میں لکھ دیا کہ:-

"میں تو ایک معمولی آدمی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر نبی کریم بھی دوبارہ پیدا ہو کر اس ملک میں اسلام کی تعلیم دیں۔ تو غالباً اس ملک کے لوگ اپنی موجودہ کیفیات اور اثرات کے ہوتے ہوئے حقائق اسلامیہ کو نہ سمجھ سکیں۔

اسلام ایک سادہ مذہب ہے۔ لیکن اس کی بدیہیات کے اندر ایسی ایسی مشکلات ہیں جن کی حقیقت کا سمجھنا آسان کام نہیں"۔

(مکاتیب اقبال ص ۵۳)

اسی لیے وہ اپنے ایک اور خط میں عقل پرستوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ:-

"مذہب کا مقصود عمل ہے۔ نہ کہ انسان کے عقلی اور دماغی تقاضوں کو پورا کرنا۔ اسی واسطے قرآن شریف کہتا ہے۔ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔ اگر مذہب کا مقصود عقلی تقاضاؤں کو پورا کرنا ہو بھی۔ تو زمانہ حال کی خصوصیات کے اعتبار سے اس کو نظر انداز کرنا

چاہیئے۔ اس وقت وہی قوم محفوظ رہے گی۔ جو اپنی عملی روایات پر قائم رہ سکے گی۔

"اس دور میں سب مٹ جائیں گے۔ ہاں باقی وہ رہ جائیگا جو اپنی راہ پہ قائم ہے۔ اور پکا اپنی ہٹ کا ہے"

(مکاتیب اقبال ص)

تلقینِ اقبال

علوم اسلامیہ سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے علامہ اقبال مسٹر کو، جسی "کولہو کے بیل" کے اتباع کی تلقین کرتے ہیں۔ جسے مسٹر آج کشتنی و گردن زدنی سمجھتا ہے۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ:۔

"دین کی اصل حقیقت آئمہ اور علماء کی کتابیں پڑھنے سے ہی کھلتی ہے اور آج کل زمانے کا اقتضا۔ یہ ہے کہ علم دین حاصل کیا جائے اور اسلام کے علمی پہلو کو نہایت وضاحت سے پیش کیا جائے"۔

(مکاتیب اقبال ص)

کیونکہ:۔

"اس وقت مذہبی اعتبار سے دنیائے اسلام کو راہنمائی کی سخت ضرورت ہے۔ اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے بعض علماء۔ اس کام کو

باحسن وجوہ انجام دے سکتے ہیں۔ سیاسی اعتبار سے تو ہم باقی اقوامِ اسلامیہ کو کوئی ایسی مدد نہیں دے سکتے۔ ہاں دماغی اعتبار سے ان کے لئے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔" (اقبال نامہ صفحہ ۱۹۴)

بالفاظ دیگر علامہ اقبال نے محب الحق بہاری۔ تمنا عمادی۔ اسلم جیراجپوری۔ غلام احمد پرویز۔ غلام جیلانی برق اور خلیفہ عبدالحکیم ایسے حضرات کا لٹریچر ذوق و شوق سے پڑھنے والوں سے اپیل کی ہے کہ اگر وہ دنیائے اسلام کی راہنمائی کرنا چاہتے ہیں۔ تو انہیں ان علوم اسلامیہ سے ناواقف "مفکروں" کی بجائے علماء حق کی رہنمائی حاصل کرنی چاہیئے۔ جو علوم اسلامیہ کے ماہر ہیں۔

مسٹر کا مشورہ

علماء کرام کو جلی کٹی سنانے کے بعد خلیفہ صاحب ناصح مشفق بن کر مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ:۔

"یہ یقین مان لیجئے کہ پاکستان اگر باقی رہ سکتا ہے۔ اور ایک مہذب مملکت کے طور پر ترقی کر سکتا ہے اور ملت اسلامیہ میں روح پھونک سکتا ہے تو وہ اقبال کے نظریہ حیات کو اپنانے سے ہی ہو سکتا ہے۔ دونوں چیزیں یک جا نہیں ہو سکتیں۔"

(اقبال اور ملا صفحہ ۴۲)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بزم اقبال کے مدار المہام اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کے صدر خلیفہ صاحب اقبال کے نظریۂ حیات یا اسلام کے نظریہ حیات کو آج تک سمجھ ہی نہیں سکے۔ یا علامہ دشمنی کے جذبہ کے ماتحت اسے دانستہ غلط طور پر پیش کر رہے ہیں۔ کیونکہ علامہ اقبال تو فرماتے ہیں کہ۔۔

(ا) "عرب ہمیشہ اسلام کے لئے قوتِ عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں۔"

(حرفِ اقبال صفحہ ۱۶۳)

(ب) "مجھے اس جماعت سے دلی محبت ہے جو میرے اوضاع و اطوار اور میری زندگی کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے دین اور اپنے ادب، اپنی حکمت اور اپنے تمدن سے بہرہ مند کر کے مجھے وہ کچھ عطا کیا ہے جس سے میری موجودہ زندگی کی تشکیل ہوتی ہے۔"

(ایضاً صفحہ ۲۹)

اس واضح اعتراف کے بعد یہ کہنا کہ ملائیت اقبال کے نظریہ حیات کی شدید دشمن ہے۔ ایک ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ جب اقبال کے اپنے ارشادات و فرمودات کے مطابق اقبال نے فیض ہی ملائیت سے پایا ہو، سیالکوٹ کے اقبال کو دنیائے اسلام کا اقبال ہی "ملائیت" نے بنایا ہو۔ تو

ان کے نظریئے ایک دوسرے کے مخالف کیسے ہو سکتے ہیں۔

نظریۂ اقبال

خلیفہ صاحب جس نظریہ کو اقبال کا نظریہ ظاہر کر رہے ہیں وہ فی الحقیقت اقبال کا نظریہ نہیں۔ بلکہ خود خلیفہ صاحب کا نظریہ ہے۔ جسے وہ اقبال کی آڑ میں پیش کر رہے ہیں۔ علماء جن اصولوں پہ پاکستان کی بقاو تہذیب کے خواہاں ہیں۔ انہی اصولوں پہ عمل پیرا ہونے کی اقبال بھی دعوت دیتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے پاکستان کا مطالبہ کرتے وقت ہی صاف صاف کہہ دیا تھا۔ کہ اگر آپ اسلامی سلطنت حاصل کرنا اور باقی رکھنا چاہتے ہیں تو:—

مادیات سے گذر کر روحانیات میں قدم رکھئے۔ مادہ کثرت ہے لیکن روح نور ہے۔ حیات ہے۔ وحدت ہے۔ ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے۔ یہ ہے کہ آڑے وقتوں میں اسلام ہی نے مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا۔ مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں۔ اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں۔ تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سر نو جمع ہو جائیں گی۔ اور آپ کا

وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا!"

(خطبہ صدارت الہ آباد کانفرنس)

اندریں حالات اقبال اور علماء کے نظریات میں سرمو کوئی فرق نہیں۔ خلیفہ صاحب کو ان کے نظریات سمجھنے میں مغالطہ ہوا ہے یا وہ دانستہ لوگوں کو مغالطہ میں ڈال رہے ہیں۔

مُلّا اور مسٹر

اسلام چونکہ ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جس میں پوری کی پوری انسانی زندگی محدود و محصور ہو کر رہ جاتی ہے اس لئے دینی امور کی تفہیم اور اشاعت و تبلیغ کے لئے ایک مخصوص جماعت قائم کرنے کا حکم دیا گیا۔ کہ

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ	اور تم میں ایک ایسی جماعت
يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ	ہونی چاہیئے جو نیک کام کی
يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	طرف بلاتی رہے اور اچھے
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط	کاموں کا حکم کرتی رہے اور
(آل عمران ۱۱/۴)	برائی سے روکتی رہے۔

اس لئے علماء حق کی جماعت کسی مخصوص دور کی پیداوار نہیں ہے اور نہ علماء

سو۔ کی طرح کسی خاص نظامِ حکومت کی سیاسی سازش کا نتیجہ ہے۔ بلکہ ابتدائے اسلام سے ہی امت کی اجتماعی ضروریات نے اس طبقہ کو پیدا کیا۔ اور اسی کی انتھک کوششوں۔ کاوشوں اور محنتوں سے ہم تک اسلامی علوم اور تاریخ پہنچی اور اسی کے اتباع میں علامہ اقبال قوم کی بہتری سمجھتے تھے۔

بخلاف اس کے مشرکا وہ طبقہ جو حدود و قیود اسلام سے نکلنے کے لئے علماء حق کو اسلام کا دشمن قرار دے رہا ہے۔ اُس نظامِ حکومت کی پیداوار ہے۔ جو شروع سے اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے بر سرِ پیکار رہا جس نے مدتوں مسلمانوں کو نوک سنگین غلام بنائے رکھا۔ جس کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا کہ:۔

"غلام قوم مادیات کو روحانیات پر مقدم سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور سبب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے۔ تو ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے۔ جس کا مقصد قوتِ نفس اور روحِ انسانی کا ترفع ہو۔" (اقبال نامہ صـ۳۰۱)

علامہ اقبال اس طبقہ کے دعویٰ اسلام کو ایک فریب اور منافقت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

اس پیشگوئی کا مصداق سمجھتے تھے کہ "ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ مسلمانوں میں یہود اور نصاریٰ کے سے انداز پیدا ہو جاویں گے"۔ اور اس کی صورت و سیرت دیکھ کر حیرت سے فرماتے تھے ؎

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

اسی طبقہ نے بدگمانیاں پھیلا کر قدیم و جدید گروہوں میں بیگانگی پیدا کر دی ہے اور دینداروں اور روشن خیالوں کے درمیان ایک خلیج حائل کر کے معاملہ یہاں تک بگاڑ دیا ہے کہ ؎

واعظ دلیل لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا ہی چھوڑ دے

اگرچہ تہذیب جدید کے فرزندوں میں علمائے حق کی طرح ایک سلیم الصفات طبقہ بھی موجود ہے جس کے متعلق اشرف العلماء حضرت مولانا اشرف علی صاحب فرماتے ہیں کہ :-

"ان کی گفتگو میں مزہ آتا ہے کیونکہ یہ سمجھ میں آنے سے مان لیتے ہیں"۔ (کمالات اشرفیہ ص ۳۲۹)

مگر علامہ اقبال کے الفاظ میں "اس دورِ بدتمیزی میں" یہ شریف النفس طبقہ بھی علمائے حق کی طرح ایک خاموش زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ جس

کی وجہ سے اقتدار پرست اور علمار دشمن لوگوں نے اسلام کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ دیندار اور روشن خیال حضرات مل کر اس فتنہ کا ابھی سے انسداد کریں۔ ورنہ ہماری آنے والی نسلوں میں اتنا بھی اسلام نظر نہ آئے گا۔ جو موجودہ نسل میں نظر آرہا ہے اور اس کا تمام وبال ہمارے سر پر ہوگا۔

حرف آخر

یہ ایک کتنی افسوسناک حقیقت ہے کہ آج اقبال کے بعض نام لیوا، اقبال کے نام کو، جن کا پیغام اسلام کا بنیادی ہے تفریق بین المسلمین کے لئے استعمال کر رہے ہیں اور بزم اقبال کے خلیفہ صاحب اس معاملہ میں سب سے پیش پیش ہیں۔ جن کی دیانت و صداقت کے چند شاہکار اوپر پیش کئے جا چکے ہیں۔ اگرچہ خلیفہ صاحب نے ان کے علاوہ بھی بہت سی بے بنیاد باتیں لکھی ہیں۔ لیکن بخوف طوالت صرف انہی کی وضاحت پر اکتفا کیا گیا ہے۔ کیونکہ جو صاحب علامہ اقبال کی ذات سے ایسی بے سروپا باتیں منسوب کر سکتے ہیں۔ ان کے دوسرے الزامات کی صحت کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے۔ آخر دیگ کے معیار کا چند چاولوں ہی سے تو پتہ لگایا جاتا ہے۔

خلیفہ صاحب کے رسالہ "ثقافت" میں بھی بعض مضامین اس قسم کے دیکھے گئے ہیں۔ جو اسلامی نقطہ نگاہ سے محل نظر ہیں۔ اور ان پر "صدق جدید" اور "فاران" وغیرہ میں کڑی تنقیدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اور انہیں "خیر سے شر" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایسی ہی تحریریں اکثر مختلف جرائد میں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اور انہی کے ذریعہ تو تعلیم یافتہ طبقہ کو گمراہ کیا جا رہا ہے اور ملک میں لادینی کا ایک سیلاب لایا جا رہا ہے۔

اس لئے ضرورت ہے کہ جس طرح آئینی جدوجہد کے سلسلہ میں ملک کے مختلف الخیال علماء کرام نے متحد ہو کر ایک تاریخی مثال قائم کی ہے۔ اسی طرح اس سیلاب کو روکنے کے لئے بھی وہ متحد ہو جائیں اور ملک کے تمام دینی ادارے مل کر ایک ایسا مرکزی شعبہ نشر و اشاعت قائم کر دیں جس میں علوم قدیم و جدید کے ماہر اہل قلم حضرات کو فکر معاش سے آزاد کر کے بٹھایا جائے۔ ان کے پاس ایک وسیع لائبریری ہو۔ ملک بھر میں شائع ہونے والے لٹریچر کا وہ جائزہ لیں۔ اور ایک ماہوار یا ہفتہ وار رسالہ یا اخبار کے ذریعہ وہ گمراہ کن امور کے متعلق ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کی رہنمائی کریں۔ اختلافی امور اس کے دائرہ تحریر سے باہر ہوں۔ صرف کتاب و سنت کی قطعی نصوص تک

اس کی سرگرمیاں محدود رہیں۔ علماء طبقہ میں یہ تجویز کئی بار زیر بحث آچکی ہے اور اکثر اس کی تائید میں ہیں۔ مگر ان کی حد سے بڑھی ہوئی مصروفیات اس سلسلہ میں مانع ہو رہی ہیں۔ اگر چند باہمت حضرات اس کام کے لئے میدان عمل میں نکل آئیں۔ اور ہر دینی ادارہ اپنے فنڈ میں سے حصہ رسدی اس تبلیغی ادارہ کو اسی طرح چندہ ادا کرے جس طرح ہر ملک ادارہ اقوام متحدہ کو ادا کرتا ہے تو ملک وملّت کی ایک اہم ترین ضرورت بلا وقت پوری ہو سکتی ہے۔

ضمیمہ

یہ رسالہ اہم ترین اضافوں کے بعد کاتب کے پاس جا چکا تھا کہ میرے ایک مخلص بزرگ نے جو خلیفہ صاحب کے دوست ہیں، اس کا پہلا ایڈیشن مطالعہ فرمانے کے بعد اس کے متعلق اپنی مخلصانہ رائے سے یوں آگاہ فرمایا:۔

"میری ناقص رائے میں ایسی بحثیں بیکار ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کا مقصد محض علماء سو جنہیں عرفِ عام میں مُلّا کہا جاتا ہے کی تخریبی کارروائیوں کی طرف اشارہ کرنا تھا۔ علامہ اقبال رح کے اشعار بھی اسی مضمون پر حاوی ہیں۔ آپ نے خواہ مخواہ علماءِ صالح کو بھی اس کا ہدف سمجھا۔"

ممکن ہے میرے محترم کرم فرما کی طرح بعض دوسرے حضرات بھی اسی حسن ظن میں مبتلا ہوں، اس لئے ایسے حضرات کی آگاہی کے لئے مندرجہ ذیل سطور کا مزید اضافہ کرنا پڑا۔

متذکرہ بالا تجربے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل رسالہ "اقبال اور مُلّا" ان کی نظر سے نہیں گزرا اور اگر گزرا ہے۔ تو محض سرسری طور پر۔ ورنہ وہ بالیقین اس کے متعلق یہ حسن ظن سے کام نہ لیتے۔ کیونکہ خلیفہ صاحب نے اپنے رسالہ میں کہیں بھی علماء حق اور علماء سوء کے درمیان خطِ امتیاز کھینچنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کا مقصد خواہ کتنا ہی نیک ہو۔ مگر افسوس کہ ان کے الفاظ اور ان کا اندازِ بیان ان کے مقصد کی ترجمانی نہیں کرتا۔ بلکہ وہ بہت حد تک

غیر ذمہ دارانہ اور گمراہ کن ہے۔ اس لئے اس کی تردید ضروری سمجھی گئی۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام ایک نہایت سادہ مذہب ہے۔ مگر اسی اقبال کے قول کے مطابق جنہیں خلیفہ صاحب "قرآن کا شاعر اور شاعرِ قرآن" قرار دیتے ہیں:۔

"اس (اسلام) کی بدیہیات کے اندر ایسی ایسی مشکلات ہیں جن کی حقیقت کو سمجھنا آسان کام نہیں۔" (مکاتیبِ اقبال صفحہ ۵۲)

اسی لئے علامہ اقبال نے مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" میں فرمایا کہ ؎

علم و حکمت از کتب، دیں از نظر

جب محمد حسین صاحب عرشی نے علامہ اقبال سے دریافت فرمایا کہ:۔

"اس مصرع میں "نظر" سے آپ کی کیا مراد ہے؟ فرمایا "صحبت"۔"

(ملفوظاتِ اقبال صفحہ ۲۶)

ہمارے نو تعلیم یافتہ طبقہ کو چونکہ بزرگانِ دین کی صحبت حاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے ان پر دین کے اسرار و غوامض نہیں کھلتے۔ ان کی نظر چھلکے اور شکل تک محدود رہتی ہے۔ مغز و معانی تک نہیں پہنچتی۔ مثلاً خلیفہ صاحب اپنے رسالہ "اقبال اور ملا" کے پہلے ہی صفحہ پر لکھتے ہیں کہ:۔

"جس اسلام نے فقط لا الٰہ الا اللہ کہنے والے کو مسلم قرار دیا تھا اور

لا اکراہ فی الدین کی عالمگیر رواداری کا اعلان کیا تھا۔ اس کے اندر فروعی عقاید کی بنا پر مخالفت اور منافرت تاریخ دین کا ایک المناک حادثہ ہے۔ ایسے مسلمان اسلام کو کس طرح امن عامہ کا ضامن اور کفیل بنا سکیں گے۔ جن کے اندر خود ہفتاد و دو ملت کی جنگ زندگی کا جزو لاینفک بن جائے؟

اول تو خلیفہ صاحب کا یہی نظریہ محل نظر ہے کہ اسلام کا تقاضا صرف لا الہ الا اللہ پڑھنا اور لا اکراہ فی الدین پر عمل کرنا ہے۔ صرف اتنا کرنے سے کوئی شخص ان ذمہ داریوں سے نہیں بچ سکتا۔ جو اس کلمہ طیبہ کے پڑھ لینے کے بعد اس پر اوامر و نواہی کی پابندی کی صورت میں عاید ہوتی ہیں۔

۲۔ جب خلیفہ صاحب ہفتاد و دو فرقوں کے جن فروعی عقاید کی مخالفت و منافرت کو تاریخ دین کا المیہ قرار دیتے ہیں۔ اسے صاحب نظر اقبال المیہ قرار نہیں دیتے۔ بلکہ مبارک سمجھتے ہیں۔

قادیانیت کی شدید مخالفت کے زمانہ یعنی ۱۹۳۶ء میں ایک روز جناب خضر تیمی صاحب اور صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم علامہ اقبال کو ملنے گئے بدوران گفتگو خضر تیمی صاحب نے عرض کیا کہ:-

"آخر اسلام میں اور فرقے بھی تو ہیں۔ صرف قادیانی صاحبان کی مخالفت ہی کیوں کی جائے؟"
اس پر علامہ اقبال نے فرمایا:-

"اُن کا اختلاف بنیادی نہیں بلکہ فروعی ہے۔ اور حقیقت میں یہ اسلامی فرقے
مختلف گروہ ہائے خیال (Schools of thought) ہیں۔ جن کے اختلافات
فقہ پر مبنی ہیں۔ ہر ایک فرقہ اسلام کے مسلمات پر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر
ایمان رکھتا ہے۔ لیکن قانون اسلامی کے بعض حصوں کی تشریح میں ایک دوسرے
سے اختلاف رکھتا ہے۔ فقیہوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ تعجب ہوتا ہے کہ
یہ اصحاب "خشک" ہونے کے باوجود حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے
معاملہ میں کس قدر حساس واقع ہوئے ہیں کہ ایک صاحب اُٹھتے ہیں کہ نبی کریمؐ
نے فلاں کام اس طرح کیا اس دعوے کی تائید میں وہ ہر ممکن ثبوت (قرآن حدیث
یا دیگر ماخذ سے) بہم پہنچاتے ہیں۔ دوسرے صاحب اس کی تردید میں فرماتے
ہیں کہ نہیں۔ یہ کام حضورؐ نے یوں سرانجام دیا۔ وہ اپنے دلائل الگ پیش
کرتے ہیں۔ جس سے مستفیر کو حضورؐ کی مبارک زندگی کے ایک خاص پہلو کے
متعلق مختلف معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ ان حضرات کی زندگی کا محبوب
سرمایہ حضورؐ کا اسوہ حسنہ ہے۔ جس کے ہر پہلو کو اس قدر حزم و احتیاط

سے محوظ رکھتے ہیں:- (ملفوظاتِ اقبال صفحہ ۲۸۲)

گویا جس امر کو خلیفہ صاحب نے شر سے تعبیر کیا ہے۔ علامہ اقبال اسے خیر قرار دیتے ہیں۔ اس ایک مثال سے واضح ہو گیا ہے کہ اسلامیات کے متعلق تہذیبِ جدیدہ کے فرزندوں کے نظریات نہ صرف سطحی ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات محلِ نظر بھی۔ کیونکہ مغربی مکتبۂ فکر میں دین فہمی کی صلاحیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی جس کی وجہ سے اسلامی محاسن انہیں معائب نظر آنے لگتے ہیں۔ اسی لئے علامہ اقبال فرماتے تھے کہ:-

"مسلمانوں نے دُنیا کو دکھانے کے لئے دنیوی تعلیم حاصل کرنی چاہی لیکن نہ تو دُنیا حاصل کر سکے اور نہ دین سنبھال سکے۔

اسلام تہذیبِ حاضرہ کی تمام ضروری اور اصولی چیزوں کا دشمن ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اسے تباہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے نہ یہ کہ ان چیزوں کو جزوِ اسلام بنا لیا جائے۔" (ملفوظاتِ اقبال صفحہ ۲۰۹)

ایسے حالات میں نو تعلیم یافتہ طبقہ کے افکار و خیالات کو بلا تحقیق قبول کر لینا خطرے سے خالی نہیں۔ اس لئے ان پر غور و فکر اور تنقید و تبصرہ کو غیر ضروری قرار دینے کی بجائے اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے کہ اس طرح اہم اور مفید نکات منظرِ عام پر آ جاتے ہیں۔